تعلق باللہ
از
حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب خلیفۃ المسیح الثانی رضؓ

از

حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب خلیفۃ المسیح الثانیؓ

نام کتاب	:	تعلّق باللہ (ماخوذ از انوار العلوم جلد 23)
مصنّف	:	حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد رضی اللہ تعالیٰ عنہ
سن اشاعت	:	اپریل/2016ء
تعداد	:	1000
شائع کردہ	:	نظارت نشر و اشاعت صدر انجمن احمدیہ قادیان، ضلع: گورداسپور، صوبہ: پنجاب، انڈیا-143516
مطبع	:	فضل عمر پرنٹنگ پریس قادیان

ISBN: 978-93-83882-88-5

Talluq Billah

By

Hadhrat Mirza Bashiruddin Mahmood Ahmad[ra]

Khalifatul Masih 2nd

عرض ناشر

کتاب 'تعلق باللہ' حضرت خلیفۃ المسیح الثانی المصلح الموعود رضی اللہ عنہ کی ایک معرکۃ الآراء تقریر ہے جو حضورؓ نے مورخہ 28؍دسمبر 1952ء کو جلسہ سالانہ ربوہ کے موقعہ پر بیان فرمائی۔ نظارت نشرواشاعت قادیان حضرت امیر المومنین خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی منظوری سے اس تقریر کو کتابی صورت میں شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہی ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔ اس کتاب کا متن انوار العلوم جلد 23 سے ماخوذ ہے۔

اس کتاب میں حضرت مصلح موعودؓ نے اللہ تعالیٰ سے پختہ تعلق پیدا کرنے اور اس کی معرفت اور عرفان حاصل کرنے کے ذرائع بیان فرمائے ہیں۔ اس کتاب کی اہمیت کے پیش نظر اس کا ہر گھر میں ہونا اور ہر فرد جماعت کے زیر مطالعہ رہنا از حد ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام احباب جماعت کو اس کتاب سے کما حقہ استفادہ کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

ناظر نشرواشاعت قادیان

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ نَحْمَدُہٗ وَ نُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

تعلق بِاللہ

(تقریر فرمودہ ۲۸؍دسمبر ۱۹۵۲ء برموقع جلسہ سالانہ ربوہ)

تشہّد ،تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:۔

میری آج کی تقریر کا موضوع تعلق بِاللہ ہے میں نے پچھلے دنوں اپنے ایک خطبہ میں بھی بیان کیا تھا کہ بہت سے لوگ میرے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دعا کریں بیٹا ہو جائے۔کوئی کہتا ہے دعا کریں میری بیوی اچھی ہو جائے۔کوئی کہتا ہے دعا کریں مجھے کوئی بیوی مل جائے۔کوئی کہتا ہے دعا کریں میرا اپنی بیوی سے ایک جھگڑا چل رہا ہے اُس میں صلح کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔کوئی کہتا ہے دعا کریں مجھے نوکری مل جائے۔کوئی کہتا ہے دعا کریں میں امتحان میں کامیاب ہو جاؤں۔کوئی کہتا ہے دعا کریں مجھے اپنی ملازمت میں ترقی مل جائے۔کوئی کہتا ہے دعا کریں میری فلاں جگہ سے تبدیلی ہو جائے۔اسی طرح عورتیں میرے پاس آتی

ہیں تو کوئی کہتی ہے میرے ہاں صرف لڑکیاں ہیں دعا کریں کہ کوئی لڑکا ہو جائے۔ کوئی کہتی ہے میرے خاوند کا سلوک میرے ساتھ اچھا نہیں دعا کریں کہ اُس کا سلوک اچھا ہو جائے کوئی کہتی ہے میرے خاوند کا سلوک تو اچھا ہے لیکن دعا کریں کہ وہ اس سے بھی زیادہ اچھا سلوک کرے۔ کوئی کہتی ہے میرے ماں باپ اور خاوند کے درمیان کوئی جھگڑا ہے دعا کریں کہ اُن کی آپس میں صلح ہو جائے۔ غرض جتنی ضرورتیں بیان کی جاتی ہیں وہ ساری کی ساری ایسی ہوتی ہیں جو اس دنیا کی زندگی کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں حالانکہ سب سے مقدّم دعا اگر کوئی ہوسکتی ہے تو یہی ہے کہ ہمارا اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا ہو جائے اور سب سے مقدم سوال اگر کوئی شخص کر سکتا ہے تو یہی ہے کہ میری اِس بارہ میں راہنمائی کی جائے کہ مجھے تعلق بِاللہ کس طرح حاصل ہوسکتا ہے کیونکہ ہماری زندگی کا سب سے بڑا مقصد یہی ہے۔ اگر ہمارا اللہ تعالیٰ کے ساتھ سچا تعلق پیدا ہو جائے تو باقی سب چیزیں اِسی میں آ جاتی ہیں جیسے کہتے ہیں کہ ''ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں''۔

تذکرۃ الاولیاء میں لکھا ہے کہ کوئی بزرگ تھے جن کے ہمسایہ میں کوئی امیر شخص رہتا تھا جو رات دن ناچ گانے کی مجالس گرم رکھتا تھا اور ہر وقت شور وغوغا ہوتا رہتا تھا چونکہ اس طرح اُن کی عبادت میں خلل واقعہ ہوتا تھا ایک دن اُنہوں نے اُسے سمجھایا اور کہا کہ تم رات کو باجے بجاتے اور اُونچا اُونچا گاتے ہو اس طرح میری عبادت میں خلل آتا ہے مناسب یہ ہے کہ تم اِس قسم کی مجلسوں کو بند کر دو۔ وہ امیر آدمی بادشاہ کا مصاحب تھا اُسے یہ بات بُری لگی اور اُس نے بادشاہ کے پاس شکایت کر دی کہ اِس طرح بعض لوگ ہمارے گانے بجانے میں مزاحمت کرتے

ہیں۔ بادشاہ نے فوج کا ایک دستہ اُس کے مکان پر بھجوا دیا۔ جب شاہی فوج آ گئی تو اُس نے اُس بزرگ کو کہلا بھجوایا کہ میری حفاظت کے لئے فوج آ گئی ہے اگر طاقت ہے تو مقابلہ کرلو۔ اُس بزرگ نے جواب دیا کہ اِن سامانوں سے تو مقابلہ کی مجھ میں طاقت نہیں لیکن لڑائی ہم نے بھی نہیں چھوڑنی۔ اگر ہم تیروں سے تمہارا مقابلہ کریں تو نہ معلوم ہمارا تیر نشانہ پر پڑے یا نہ پڑے اِس لئے ظاہری تیر اور تلوار کی بجائے ہم رات کے تیروں سے تمہارا مقابلہ کریں گے۔ جب یہ پیغام اُسے پہنچا تو معلوم ہوتا ہے اُس کے اندر تھوڑی بہت نیکی تھی پہلے تو وہ خاموش رہا لیکن کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اُس کی چیخ نکل گئی اور اُس نے کہا مجھے معاف کیا جائے آج سے باجا گانا سب بند ہو جائے گا کیونکہ رات کے تیروں کے مقابلہ کی نہ مجھ میں طاقت ہے اور نہ میرے بادشاہ میں طاقت ہے۔ تو حقیقت یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا ملنا اور اُس سے انسان کا تعلق پیدا ہو جانا یہ سب سے اہم اور ضروری چیز ہے اور اگر خدا مل سکتا ہے تو پھر اس میں کوئی شُبہ ہی نہیں رہتا کہ ہمارا سب سے بڑا فرض یہی رہ جاتا ہے کہ اُس کے ساتھ تعلق پیدا کریں اور اس طرح اپنی زندگی کے مقصد کو حاصل کرلیں۔

اِس مضمون کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلا سوال انسان کے دل میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا خدا ہے یا نہیں؟ اور پھر دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا خدا مل سکتا ہے یا نہیں؟ اگر اس دنیا کا کوئی خدا ہے اور اگر وہ خدا ہمیں مل سکتا ہے تو اس میں شبہ ہی کیا ہے کہ پھر سب سے مقدم چیز وہی ہے۔ بعض لوگ مُرغا کھانے کے بہت شوقین ہوتے ہیں۔ چودھری ظفر اللہ خان صاحب میرے بچپن کے دوست ہیں اُنہیں

مُرغے کی ٹانگ بڑی پسند ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھی بڑی پسند تھی ایک دوست جو فوت ہو گئے وہ کہا کرتے تھے کہ اگر کسی کو ساری عمر مُرغے کی ٹانگ ملتی رہے تو اُسے اَور کیا چاہیے لیکن مجھے پسند نہیں کیونکہ اُس کی بوٹی میرے دانت میں پھنس جاتی ہے۔ بہرحال بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو لوگوں کو بہت مرغوب ہوتی ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ اگر وہ چیزیں اُنہیں مل جائیں تو وہ بڑے خوش قسمت ہیں لیکن وہ چیزیں بہت ادنیٰ اور معمولی ہوتی ہیں اور پھر اُن چیزوں کے حصول کے بعد بھی اور ہزاروں چیزوں کی احتیاج انسان کو باقی رہتی ہے لیکن اِس میں کوئی شُبہ نہیں کہ اگر خدا تعالیٰ پر ہمیں کامل یقین ہو اور اگر خدا ہمیں مل سکتا ہو تو پھر قطعی اور یقینی طور پر انسان کہہ سکتا ہے کہ اس کے بعد مجھے کسی اَور چیز کی کیا ضرورت ہے۔ انبیاء بڑے قیمتی وجود ہیں اور اُن کی محبت انسان کے ایمان کا ایک ضروری جزو ہے لیکن یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ کسی کو خدا مل جائے اور اُسے انبیاء نہ ملیں۔ انبیاء تو اُسے شوق سے ملیں گے اور کہیں گے کہ جو تمہارا محبوب ہے وہ ہمارا بھی محبوب ہے اور جب وہ تم سے محبت کرتا ہے تو ہم بھی تم سے محبت رکھتے ہیں۔

مذاہبِ عالَم پر نظر ڈالنے سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے متعلق تمام مذاہب اس بات پر متفق ہیں کہ وہ مل سکتا ہے گو اُس کے ملنے کی شکلیں اُن کے نزدیک الگ الگ ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلے ہم یہودی مذہب کو دیکھتے ہیں۔ یہودی مذہب کے مطالعہ سے صاف پتہ لگتا ہے کہ خدا مل سکتا ہے۔ حضرت نوحؑ کے ایک دادا تھے جن کا نام حنوک تھا اُن کے متعلق بائبل میں لکھا ہے کہ وہ تین سَو برس تک خدا کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ [1]

اور یہودی حدیثوں میں لکھا ہے کہ:

''لوگوں کے گناہوں کی وجہ سے خدا نے زمین کو چھوڑ دیا اور حنوک کو آسمان پر اُٹھالیا اور آسمانی خزانوں کا اس کو نگران اور فرشتوں کا سردار مقرر کر دیا اور خدا کے تخت کے سامنے خاص مصاحب کے طور پر وہ مقرر کیا گیا۔ اُس کو سب راز معلوم ہیں اور فرشتے اُس کی پشت پر ہیں اور وہ خدا کا منہ ہے اور وہ خدا کے احکام کو دنیا میں جاری کرتا ہے''۔ [۲]

پھر بائبل میں لکھا ہے کہ خدا تعالیٰ نے حضرت یعقوب علیہ السلام کے ساتھ کشتی کی اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے خدا تعالیٰ کو گرالیا یعنی خدا ہار بھی گیا [۳] اور یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ دراصل یہ ایک کشفی واقعہ ہے کوئی لغو اور بیہودہ قصہ نہیں۔ بچوں کے ساتھ گھروں میں روزانہ ایسا ہوتا ہے کہ ماں باپ ہنسی مذاق میں اُن کے ساتھ کشتی کرتے ہیں اور پھر کشتی کرتے کرتے خود گر جاتے ہیں اور بچہ اُن کے سینہ پر سوار ہو جاتا ہے اور وہ قہقہہ مار کر کہتا ہے کہ میں نے ان کو گرالیا۔ اسی طرح اللہ میاں نے بھی حضرت یعقوب علیہ السلام سے ضرور کشتی کی ہوگی اور پھر خدا تعالیٰ محبت اور پیار کے انداز میں خود ہی گر گیا ہوگا اور یعقوب علیہ السلام نے قہقہے مارے ہونگے کہ میں نے خدا کو بھی گرالیا۔

پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئے۔ اُن کی زندگی کی تاریخ جو انجیل میں ہے اُس سے بھی یہی پتہ لگتا ہے کہ وہ خدا سے ملے۔ چنانچہ اُن کا خدا کو باپ کہنا اور اپنے آپ کو اُس کا بیٹا کہنا صاف بتاتا ہے کہ اُن کا خدا تعالیٰ سے ایسا ہی تعلق تھا جیسے دنیا میں ماں باپ اور بیٹوں کے درمیان ہوتا ہے۔

ہندوؤں نے خدا تعالیٰ کو زیادہ تر ماتا کی شکل میں پیش کیا ہے مگر بہر حال ہندو مذہب بھی خدا تعالیٰ کے تعلق اور اُس کے پیار کا قائل ہے۔ اسلام نے بھی اللہ تعالیٰ کی محبت کو ماں اور باپ کی محبت سے مشابہت دی ہے اور اس میں کیا شُبہ ہے کہ ماں اور باپ کا بھی اپنے بچہ سے بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے۔

اسی طرح زرتشتی مذہب لے لو، بدھ مذہب لے لو، سب میں یہی نظر آئے گا کہ انسان روحانیت میں ترقی کرتے کرتے ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ اُس کا خدا تعالیٰ سے براہِ راست تعلق ہو جاتا ہے۔ بدھ مذہب کی کتابوں میں تو یہاں تک لکھا ہے کہ حضرت بدھ ایک جگہ بیٹھے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہو گئے اور یہ عبادت اُنہوں نے اتنے انہماک سے کی کہ ایک بانس کا درخت اُن کے نیچے سے اُگا اور اُنہیں چیر کر اُن کے سر سے نکل گیا مگر اُن کو خبر تک نہ ہوئی اور پھر اُنہیں خدا مل گیا۔ اِس قصہ کا مطلب بھی یہی ہے کہ وہ دنیا سے اتنے بیزار اور متنفر ہوئے کہ آخر انہیں خدا کا وصال حاصل ہو گیا۔ پس اللہ تعالیٰ کی ملاقات ہو سکنے کا جہاں تک امکان ہے دنیا میں کوئی بھی ایسا مذہب نہیں جو یہ کہتا ہو کہ خدا نہیں مل سکتا۔ جو لوگ خدا تعالیٰ کو مانتے ہیں اور اپنی عملی زندگی میں خدا تعالیٰ کی کتاب کو اپنا راہنما سمجھتے ہیں اور اُس کے مطابق چلنے کی کوشش کرتے ہیں وہ تو یہی یقین رکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ مل سکتا ہے۔ لیکن وہ لوگ جو اپنی عملی زندگی اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق نہیں رکھتے وہ بے شک منکر ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا نہیں مل سکتا۔ مسلمانوں میں سے جو متکلمین یا فلسفی لوگ ہیں یعنی وہ لوگ جو خالص ظاہری علوم کے دِلدادہ ہوتے ہیں یا جنہیں ہم زیادہ سے زیادہ کتابی کہہ سکتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ

سے ملاقات نہیں ہوسکتی۔ اُس سے تعلق پیدا کرنے کا صرف اتنا ہی مفہوم ہے کہ انسان کواس امر کا یقین ہو جائے کہ وہ اُس کے حکم کے مطابق نماز روزہ اور ذکرِ الٰہی وغیرہ میں مشغول ہے۔ گویا عبادت و امتثال ہی اُس سے تعلق ہے اور اُس کا احسان وانعام ہی اُس تعلق کے اظہار کا ایک ثبوت ہے۔ اِن متکلّمین کو چھوڑ کر مسلمان، عیسائی، یہودی، زرتشتی اور اسی طرح ہندو اور بدھ مذہب کے پیرو سب یہی کہتے ہیں کہ خدا مل سکتا ہے اور یہی نہیں کہ وہ مل سکتا ہے بلکہ وہ کہتے ہیں کہ اُن کے نبیوں اور دوسرے صلحاء وغیرہ کو ملا ہے اور اُس نے اُن کی تائید میں اپنے نشانات ظاہر کئے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ نہ صرف وہ انہیں ملا ہے بلکہ ہمارا ابھی یہی دعویٰ ہے کہ وہ ہم کو بھی ملا ہے اور اُس نے ایسے ایسے رنگ میں ہم سے اپنے تعلقات کا اظہار کیا ہے کہ یہ ملنا اُس سے کم ملنا نہیں جس طرح کوئی اپنے ماں باپ یا کسی اور عزیز سے ملتا ہے۔ پس متکلّمین کا یہ کہنا کہ خدا تعالیٰ انسان کو نہیں ملتا۔ اگر ہم نے اُس کی اطاعت کی تو یہ اُس کا ملنا ہو گیا اور اگر اُس نے ہم پر فضل اور احسان کیا تو یہ اُس کے تعلق کا ایک ثبوت ہو گیا۔ یہ محض فلسفیانہ رنگ کا ایک دعویٰ ہے جو خدا تعالیٰ سے دوری اور اُس کی محبت کے کرشموں کو نہ دیکھنے کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے۔ اگر تو اتنا ہی ہوتا کہ مثلاً مجھے ایک ضرورت ہوتی اور وہ پوری ہو جاتی تو گو اس سے مجھے یہ تسلی ہو جاتی کہ میری ضرورت پوری ہو گئی ہے لیکن میرے دل میں خدا تعالیٰ کی محبت پیدا نہ ہوتی لیکن میرا یہ احساس کہ میرے خدا نے میری فلاں ضرورت پوری کی ہے یہ ایک ایسی چیز ہے جو مجھے خدا تعالیٰ کی محبت میں گداز کر دیتی ہے۔

مجھے یاد ہے میری جوانی کا زمانہ تھا۔ ابھی میری خلافت پر دو تین سال ہی

گذرے تھے کہ مجھے ایک مشکل پیش آ گئی اور میں نے اُس کام کے لئے دعائیں شروع کردیں مگر میرا وہ کام نہ ہوا۔ آخر میں نے فیصلہ کیا کہ جب تک میرا یہ کام نہیں ہو جائے گا میں چارپائی پرنہیں سوؤں گا۔ میرے اندر بھی اُس وقت گاندھی کی کوئی رگ تھی اور میں نے بھی ایک رنگ میں ستیہ گرہ کردی اور زمین پر لیٹ گیا۔ امۃ الحی مرحومہ اُن دنوں زندہ تھیں اور اُنہی کے ہاں اُس دن باری تھی۔ ہم دونوں کے لئے ایک بڑی سی چارپائی ہوتی تھی اور اُس پر ہم سویا کرتے تھے مگر اُس رات میں نے امۃ الحی سے کہا کہ تم اپنا بستر اُوپر کرلو۔ میرا بستر نیچے ہی رہے گا۔ کہنے لگیں کیوں؟ میں نے کہا کوئی بات ہے۔ چنانچہ میں فرش پر بستر کر کے لیٹ گیا۔ یہ معلوم نہیں کہ مجھے لیٹے ہوئے ابھی گھنٹہ گزرا تھا یا دو گھنٹے۔ بہرحال نصف رات سے کم وقت ہی تھا کہ میں نے رؤیا میں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ میرے سامنے آیا ہے مگر وہ اُس وقت حضرت اماں جان کی شکل میں تھا (حضرت سیّد عبدالقادر جیلانیؒ کو بھی ایک دفعہ اللہ تعالیٰ اُن کی والدہ کی شکل میں ملا تھا۔ پس خشک مُلّا غصہ میں نہ آئے کہ وہ جو کچھ مجھے کہے گا وہی سیّد عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق بھی کہنا پڑے گا) اُس کے ہاتھ میں ایک نہایت نرم اور نازک لمبی سی چھڑی تھی وہ تازہ شاخ کی معلوم ہوتی تھی اور چھڑی کے ساتھ کچھ سبز پتے بھی لگے ہوئے تھے۔ چھڑی بہت نازک اور ہلکی اور باریک سی تھی اور قریباً سوا گز لمبی تھی۔ میں اُس وقت رؤیا میں یہ سمجھتا تھا کہ یہ خدا تعالیٰ کا وجود ہے جو میرے سامنے ظاہر ہوا ہے۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ حضرت اماں جان (جو درحقیقت وجود باری کا ظہور تھا) میرے پاس آئیں اور جس طرح ماں بعض دفعہ بچہ پر بظاہر غصہ کا اظہار کر رہی ہوتی ہے لیکن درحقیقت اُس غصہ

کے پیچھے محبت ہوتی ہے اِسی طرح اُنہوں نے بھی وہ چھڑی مجھے مارنے کے لئے اُٹھائی اور کہا ''محمود! لیٹتا ہے کہ نہیں چارپائی پر'' اور میں نے دیکھا کہ اِن الفاظ کے ساتھ ہی اُنہوں نے وہ چھڑی نہایت نرمی سے میرے جسم کے ساتھ چھو دی۔ اِدھر میں نے یہ نظارہ دیکھا اور اُدھر میں نے سمجھا کہ گو اللہ تعالیٰ نے چارپائی پر لیٹنے کا ہی حکم دیا ہے لیکن اگر ذرا بھی اس حکم کے ماننے میں دیر ہوئی تو میرے ایمان میں خلل آ جائے گا۔ چنانچہ جونہی اُن کا ہاتھ پیچھے ہٹا میں رؤیا کی حالت میں ہی چھلانگ لگا کر چارپائی پر آ گیا اور جب آنکھ کھلی تو میں چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔

اب فرض کرو میرا وہ کام ہو جاتا تو مجھے اِس میں کیا مزا آتا۔ مگر وہ لطف جو اُس رؤیا سے مجھے آیا اُس کا مزہ میرے دل میں آج تک باقی ہے اور اس کا خیال کر کے بھی اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں گدگدیاں پیدا کرنے لگتی ہے اور ایسا ایک دفعہ نہیں بیسیوں دفعہ ہوا ہے اور کئی کئی رنگ میں ہم نے خدا تعالیٰ کے فضل کے مشاہدات کئے ہیں اور ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ کس طرح خدا تعالیٰ محبت اور پیار کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان چیزوں میں جو لُطف ہے وہ باقی کیفیات میں کہاں ہے۔ بس ان دونوں کا ایسا ہی فرق سمجھ لو جیسے ایک ماں اپنے بچہ کو جب چھاتی سے دودھ پلا رہی ہوتی ہے تو جو اطمینان اُس بچہ کے چہرے پر دوڑتا ہوا نظر آتا ہے جس بے تکلّفی اور محبت سے وہ اپنی آنکھیں کبھی بند کرتا ہے اور کبھی کھولتا ہے، کبھی منہ مچکاتا اور کبھی مسکراتا ہے اُس کی کیفیت بالکل اور ہوتی ہے۔ اُس وقت وہ یہ نہیں سمجھتا کہ یہ مجھے دودھ پلا رہی ہے بلکہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ مجھے اپنی محبت اور پیار سے حصہ دے رہی ہے۔ اس کے مقابلہ میں تم نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ

دروازہ پر فقیر آیا تو عورت نے اُسے روٹی دے دی۔ اُس نے ایک مانگی تو عورت نے دو[۲] دے دیں۔ اُس نے خالی روٹی مانگی مگر عورت نے روٹی کے ساتھ سالن بھی دے دیا۔ مگر فقیر کو وہ مزا کہاں حاصل ہوسکتا ہے جو ایک بچہ کو اپنی ماں کا دودھ پیتے وقت حاصل ہوتا ہے کیونکہ ماں کا اپنے بچہ کو دودھ پلانا محبت کے جذبات سے تعلق رکھتا ہے اور فقیر کے مانگنے پر عورت کا اُسے روٹی یا سالن دے دینا محبت اور پیار کے جذبات کے ساتھ تعلق نہیں رکھتا بلکہ ہمدردی کے جذبہ کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ پس وہاں اور جذبہ کام کر رہا ہوتا ہے اور یہاں اور جذبہ کام کر رہا ہوتا ہے۔ اِسی طرح بے شک فلسفی طبقہ کہتا ہے کہ عبادت و امتثالِ امر میں خدا تعالیٰ سے تعلق کا پیدا ہونا ہے اور اُس کا احسان اور انعام ہی اس کے تعلق کا اظہار ہے اور ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کی توفیق ملنا بھی اُس کے فضل پر منحصر ہے اور اس کے احکام کی اطاعت بھی اللہ تعالیٰ کے احسان سے ہی تعلق رکھتی ہے۔ لیکن جو مزا اُس شخص کو حاصل ہوسکتا ہے جسے پتہ ہو کہ میرا خدا مجھے ملا ہے۔ میرا اُس کے ساتھ تعلق ہے اور اُس نے اپنی محبت اور پیار کا اظہار فلاں فلاں نعمتوں کے علاوہ براہِ راست بھی کیا ہے تو وہ مزا اُس شخص کو کہاں حاصل ہوسکتا ہے جو ان نشانوں سے محروم ہو اِن دونوں کی تو آپس میں کوئی نسبت ہی نہیں ہوسکتی۔

تعلق بِاللہ کا مفہوم

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ جب سارے انبیاء وصلحاء یہ مانتے چلے آئے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا ہوسکتا ہے تو تعلق کے معنی کیا ہیں؟ سو یاد رکھنا چاہیے کہ تعلق کے معنی عربی زبان میں لٹکنے کے ہوتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں تَعَلَّقَ الْمَرْأَةَ [۴] فلاں شخص فلاں عورت

کے ساتھ معلّق ہو گیا۔ یا کبھی ب کے ساتھ بھی اس لفظ کا استعمال ہوتا ہے یعنی کہتے ہیں تَعَلَّقَ بِالْأَمْرَأَةِ [5] فلاں عورت کے ساتھ فلاں شخص کا تعلق قائم ہو گیا اور اس کے معنی عربی زبان کے لحاظ سے یہ ہوتے ہیں کہ مَالَ قَلْبُہٗ اِلَیْھَا [6] اُس شخص کا دل شوق اور محبت کے ساتھ اُس عورت کی طرف جھکا۔ اِسی طرح کہتے ہیں تَعَلَّقَ الشَّوْکُ بِالثَّوْبِ۔ اور اس کے معنی ہوتے ہیں نَشَبَ فِیْہِ وَ اسْتَمْسَکَ۔ [7] کہیں راستہ میں سے گزرتے ہوئے اگر کانٹے پڑے ہوئے ہوں اور تمہارا کپڑا لمبا ہو تو کانٹے تمہارے کپڑوں کے ساتھ چمٹ جائیں گے اور وہ تمہارے ساتھ ساتھ گھسٹتے جائیں گے اس کو بھی عربی زبان میں تعلق کہتے ہیں۔ گویا جب کوئی چیز اس طرح لٹک جائے کہ کوشش کے ساتھ اُسے ہٹانا پڑے وہ آپ نہ ہٹے تو اُسے تعلق کہتے ہیں۔ اِسی وجہ سے علق کے معنی محبت کے بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں عَلِقَہٗ وَبِہٖ عُلُوْقًا ھَوَاہُ وَاَحَبَّہٗ یعنی عَلِقَہٗ [8] جس کے لفظی معنی یہ ہوتے ہیں کہ اُس کے ساتھ لٹک گیا۔ اِس کا مفہوم یہ بھی ہوتا ہے کہ اُس کے ساتھ محبت کی۔ ہمارے ہاں بھی ایک اِسی قسم کا محاورہ ہے۔ کہتے ہیں فلاں کے ساتھ دل اٹکا ہوا ہے۔ پس تعلق بِاللہ کے معنی ہوئے اللہ تعالیٰ کے ساتھ لٹک جانا اور ایسا تعلق قائم کر لینا کہ کوئی دوسرا پرے کرے تو کرے آپ نہ ہٹے۔ مثلاً اِس وقت میری سوٹی میرے ساتھ پڑی ہے اگر میں علیحدہ ہوں گا تو یہ گر جائے گی لیکن اگر کانٹے لگ جائیں تو میں اُنہیں اُتاروں گا تو وہ اُتریں گے یا کوئی اور شخص اُنہیں ہٹائے گا تو وہ ہٹیں گے خود بخود علیحدہ نہیں ہوں گے۔ پس تعلق ایسے گہرے ربط کو کہتے ہیں جو آپ ہی آپ نہیں ٹوٹ سکتا اور اسی کو محبت بھی کہتے ہیں پس تعلق بِاللہ کے معنی ہوئے اللہ تعالیٰ سے لٹک

جانا اور اُس سے نہ ٹوٹنے والا تعلق پیدا کر لینا۔

قرآن کریم میں بھی اس تعلق کا ذکر آتا ہے اور بتایا گیا ہے کہ انسان کا اللہ تعالیٰ سے تعلق ہے اور اس تعلق کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضلوں اور بہت بڑی نعمتوں میں سے قرار دیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ [9] خدا تعالیٰ نے انسان کو عَلَق سے پیدا کیا ہے یا یہ کہ اُس نے انسان میں عَلَق کا مادہ پیدا کیا ہے۔ خُلِقَ مِنْ فُلَانٍ [10] کے معنی عربی زبان میں یہ ہوتے ہیں کہ اُس کو اُس چیز سے پیدا کیا گیا ہے لیکن کبھی اِس کے یہ معنی بھی ہوتے ہیں کہ وہ چیز اُس کی فطرت میں ہی داخل ہے۔ مثلاً قرآن کریم میں ہی اللہ تعالیٰ انسان کے متعلق فرماتا ہے کہ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ [11] اُس نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا ہے یعنی مٹی منبع تھی انسان کی پیدائش کا۔ لیکن دوسری جگہ آتا ہے کہ خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ [12] اُس نے انسان کو جلدی سے پیدا کیا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ جلدی کوئی مادہ ہے جس سے انسان کی پیدائش ہوئی ہے بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اُس کی طبیعت میں جلدی کا مادہ رکھا گیا ہے۔ اسی طرح خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ کے یہ معنی بھی ہیں کہ اُس نے انسان کی فطرت میں عَلَق کا مادہ رکھا ہے اور یہ معنی بھی ہیں کہ عَلَق کی حالت سے ترقی دے کر اُسے پیدا کیا ہے کیونکہ عَلَق کے معنی اُس خون کے بھی ہوتے ہیں جو ماں کے رحم میں نُطفہ سے ترقی کر کے پیدا ہوتا ہے اور رحم سے چمٹا ہوا ہوتا ہے اور پھر بچہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ پس ظاہری معنی اس کے ایک یہ بھی ہیں کہ اُس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا ہے۔

یہاں یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے خَلَقَ الْإِنْسَانَ فرمایا ہے انسان کا لفظ استعمال کیا ہے جس میں عربی زبان کے لحاظ سے مرد اور عورت دونوں شامل ہوتے ہیں۔ ہمارے مُلک کی زبان میں انسان کا ترجمہ آدمی کیا جاتا ہے اور جب آدمی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو اُس سے مراد صرف مرد لئے جاتے ہیں عورتیں مراد نہیں لی جاتیں۔عورتوں کو بھی دیکھا گیا ہے کہ وہ جب آدمی کا لفظ استعمال کریں گی تو اپنے آپ کو نکال لیں گی اور صرف مردوں کو آدمی قرار دیں گی۔بعض عورتیں تو ایسی ہوتی ہیں کہ اُنہیں خواہ کتنا بھی سمجھاؤ آخر وہ یہی کہتی ہیں کہ ''آخر مرد آدمی ہیں تو اُنہیں ہم آدمی ہی کہیں گی''۔ پس یاد رکھو کہ یہاں پنجابی زبان کے لحاظ سے انسان یا آدمی کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا بلکہ یہ عربی انسان ہے اور اس میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔ بہرحال جب اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ہم نے مرد اور عورت دونوں کو عَلَق سے پیدا کیا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہر انسان عَلَق سے پیدا ہوا ہے؟ ظاہر میں تو یہی نظر آتا ہے کہ مرد عورت ماں باپ سے پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ماں باپ سے پیدا ہوئے اور اُن کے ماں باپ اپنے ماں باپ سے پیدا ہوئے اور آخر یہ سلسلہ آدم پر جا کر ختم ہو گیا جس کے ماں باپ کوئی نہ تھے مگر خدا تعالیٰ نے تو خَلَقَ الْإِنْسَانَ میں الْإِنْسَانَ کا لفظ استعمال کیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ سارے انسان۔ اب جبکہ سارے انسان عَلَق سے پیدا ہوئے ہیں تو اگر ہم یہ سلسلہ آدم پر ختم کر دیتے ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آدم انسان تھے یا نہیں؟ حوا انسان تھیں یا نہیں؟ اگر تھیں تو پھر اُن کی مائیں اور اُن کے باپ بھی ماننے چاہئیں۔ ورنہ یہ آیت غلط ہو

جاتی ہے اور اگر اُن کی مائیں تھیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس طرح پیدا ہوئیں؟ اگر کہو کہ اپنی ماؤں سے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس طرح پیدا ہوئیں؟ غرض اس طرح اس سلسلہ کو چاہے دس کروڑ سال تک لے جاؤ تمہیں یا تو یہ ماننا پڑے گا کہ نسلِ انسانی کا آغاز جس آدم وحوّا سے ہوا وہ عَلَق کے بغیر پیدا ہوئے تھے اور یا پھر تمہیں یہ ماننا پڑے گا کہ اس تسلسل میں عَلَق دومعنوں میں استعمال ہوا ہے۔ آدم تک اور معنی ہیں اور آدم وحوّا کے متعلق یا جو بھی پہلا جوڑا تھا اس کے متعلق کچھ اور معنے ہیں اور یہ آخری بات ہی درست ہے کیونکہ خدا تعالیٰ کا کلام غلط نہیں ہوسکتا اور جیسا کہ میں اوپر بتا چکا ہوں خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ کے دومعنی ہیں۔ ایک یہ کہ رحمِ مادر میں جمے ہوئے خون سے انسان کو پیدا کیا اور دوسرے یہ کہ انسان کو اسی طرح پیدا کیا کہ اُس کی فطرت میں محبت الٰہی رکھی گئی۔ تمام انسانوں کیلئے اس آیت کا یہ مفہوم ہے کہ وہ جمے ہوئے خون سے پیدا ہوئے لیکن انسانِ اوّل یا پہلے جوڑے کے متعلق اس کے یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں تعلق باللہ کے مادہ کے ساتھ پیدا کیا۔ پس یہ آیت اپنے ایک مفہوم کے لحاظ سے آدم کی تمام نسل پر چسپاں ہوتی ہے اور دوسرے مفہوم کے رو سے پہلے جوڑے اور اُس کی نسل سب پر چسپاں ہوتی ہے۔ اور نسل انسانی کا کوئی نکاح نہیں جس پر یہ آیت چسپاں نہ ہوسکتی ہو۔ گویا آدمِ اوّل کی ماں خدا تھا جس کی محبت اُس کے دل میں پیدا کی گئی تھی۔ ایک تیسرے معنی بھی اِس آیت کے ہو سکتے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ عَلَق کا تعلق انسان سے نہیں خدا تعالیٰ سے قرار دیا جائے اور معنی یہ لئے جائیں کہ انسان کی پیدائش کی وجہ وہ علاقہ تھا جو اُلوہیت کو انسانیت سے تھا یعنی اُلوہیت ایک ایسے

وجود کو چاہتی تھی جو اُس کی صفات کو ظاہر کرے۔ پس اُلوہیت کی یہ تڑپ انسان کے پیدا کرنے کا موجب ہوئی اور گویا خدا تعالیٰ انسان کے لئے بمنزلہ ماں بن گیا اور اس میں کیا شُبہ ہے کہ ماں کو بچہ سے اور بچہ کو ماں سے شدید تعلق ہوتا ہے۔ قرآن اور احادیث سے بھی صاف پتہ لگتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا اپنے بندوں سے تعلق ماں سے زیادہ ہوتا ہے۔ پس آدمِ اوّل تک تو سب لوگ اپنے ماں باپ سے پیدا ہوئے لیکن آگے ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ آدم وحوّا خدا سے پیدا ہوئے۔ یہ نہیں کہ آدم خدا میں سے نکلا بلکہ یہ کہ اُس کے پیدا کرنے کے عام ذرائع ذاتِ باری میں مرکوز ہو گئے۔ اگر خدا اپنی تقدیر خاص سے آدم کو پیدا نہ کرتا تو نسل انسانی کا سلسلہ اس دنیا میں جاری نہ ہوتا۔ پس بعد میں آنے والے انسان اپنی ماؤں سے پیدا ہوئے اور آدم وحوّا ذاتِ باری سے یعنی کُنْ فَیَکُوْنُ [۱۳] سے پیدا ہوئے۔

عَلَق کے دوسرے معنی کُلُّ مَا عُلِّقَ [۱۴] کے ہیں یعنی جو چیز لٹکائی جائے اُسے عَلَق کہتے ہیں اور عَلَق کے معنی اَلطِّیْنُ الَّذِیْ یُعَلَّقُ بِالْیَدِ [۱۵] کے بھی ہیں یعنی وہ گُندھی ہوئی مٹی جس میں اتنی چپک اور لزوجت پیدا ہو جائے کہ اگر اُسے ہاتھ لگاؤ تو وہ ہاتھوں سے چمٹ جائے۔ بعض مٹیاں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ ہاتھوں سے نہیں چمٹتیں لیکن جب ایسی مٹی ہو جو ہاتھوں سے چمٹ جائے تو اُسے عَلَق کہیں گے اور قرآن کریم سے پتہ لگتا ہے کہ طِیْن ہی سے انسان پیدا ہوا ہے۔ یوں تو ایسی طِیْن بھی ہوسکتی ہے جس میں پانی زیادہ ہو اور وہ ہاتھوں سے نہ چمٹے یا ایسی طِیْن بھی ہوسکتی ہے جو خمیر کی طرح اُبھری ہوئی ہو لیکن انسان ایسی مٹی سے پیدا کیا گیا ہے جس میں چمٹنے کی خاصیت پائی جاتی ہے اور وہ گوندھنے والے یا بنانے والے

کے ہاتھوں سے چپک جاتی ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اکثر کسی صوفی کا یہ قول پنجابی میں بیان فرمایا کرتے تھے کہ یا تو کسی کے دامن سے چمٹ جا یا کوئی دامن تجھے ڈھانپ لے۔ یعنی اس دنیا کی زندگی ایسی طرز پر ہے کہ اس میں سوائے اس کے اور کوئی راستہ نہیں کہ یا تو تم کسی کے بن جاؤ یا کوئی تمہارا بن جائے اور یہی طین سے پیدا کرنے کا مفہوم ہے۔ یعنی انسانی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ یا تو وہ کسی کا ہو کر رہنا چاہتا ہے یا کسی کو اپنا بنا کر رکھنا چاہتا ہے۔ دیکھ لو بچہ ابھی پوری طرح ہوش بھی نہیں سنبھالتا کہ کسی کے ہو جانے کا شوق اُس کے دل میں گدگدیاں پیدا کرنے لگتا ہے۔ بلوغت تو کئی سالوں کے بعد آتی ہے لیکن چھوٹی عمر میں ہی لڑکیوں کو دیکھ لو وہ کھیلتی ہیں تو کہتی ہیں یہ میرا گڈا ہے اور وہ تیری گڑیا ہے۔ آؤ ہم گڈے گڑیا کا بیاہ رچائیں۔ میرے گڈے کے ساتھ تیری گڑیا کی شادی ہوگی اور فلاں کے گڈے کی شادی کرتی ہیں اور بڑی خوشی مناتی ہیں کہ ہمارے گڈے کی شادی ہوگئی یا ہماری گڑیا کا فلاں کے گڈے سے بیاہ ہو گیا۔ پھر وہ ماؤں کی نقلیں کر کے گڑیوں کو اپنی گود میں اُٹھائے پھرتی ہیں، اُنہیں پیار کرتی ہیں اور جس طرح مائیں اپنے بچوں کو دُودھ پلاتی ہیں اسی طرح وہ اُن کو اپنے سینوں سے لگائے رکھتی ہیں کیونکہ ان کا دل چاہتا ہے کہ ہم کسی کی ہو جائیں یا کوئی ہمارا ہو جائے۔ اِسی طرح لڑکوں کو دیکھ لو جب تک بیاہ نہیں ہوتا ہر وقت ماں کے ساتھ چمٹے رہتے ہیں لیکن جب بیاہ ہو جائے تو کہتے ہیں ماں تو جائے چولہے میں ہماری بیوی جو ہے وہ ایسی ہے اور ایسی ہے اور دن رات اُس کی تعریفوں میں گذر جاتے ہیں تو اللہ اسی مضمون کی طرف اشارہ

کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ انسان کی فطرت میں ہم نے یہ مادہ رکھا ہے کہ وہ کسی نہ کسی کا ہو کر رہنا چاہتا ہے۔ اِس کے بغیر اُس کے دل کو تسلّی نہیں ہوتی۔

پھر عَلَقٍ کے معنی خصومت اور جھگڑے کے بھی ہوتے ہیں لیکن میرے مضمون کے ساتھ ان معنوں کا تعلق نہیں۔ اس لحاظ سے آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم نے انسان کے اندر جھگڑنے کا مادہ رکھا ہے۔ اِسی مضمون کو اللہ تعالیٰ نے ایک دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ وَكَانَ الۡاِنۡسَانُ اَكۡثَرَ شَیۡءٍ جَدَلاً [۱۶] جھگڑا بھی انسان تبھی کرتا ہے جب وہ کسی چیز کو ضائع نہیں ہونے دیتا۔ اس لحاظ سے اس میں بھی تعلق کا مفہوم پایا جاتا ہے اور وہ تضاد جو بادی النظر میں دکھائی دیتا ہے دور ہو جاتا ہے۔

غرض جب خدا تعالیٰ نے یہ کہا کہ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ انسان کو اللہ تعالیٰ نے عَلَق سے پیدا کیا ہے یعنی انسان کی فطرت میں اس نے اپنی محبت کا مادہ رکھ دیا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نہ صرف انسان خدا تعالیٰ سے محبت کر سکتا ہے بلکہ یہ کہ ہم نے خود انسان کے اندر محبت کا مادہ پیدا کیا ہے۔ بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو کسبی ہوتی ہیں اور بعض چیزیں کسبی نہیں بلکہ فطرتی ہوتی ہیں۔ خدا تعالیٰ کی محبت بھی کوئی کسبی چیز نہیں بلکہ وہ ایک فطرتی مادہ ہے جو ہر انسان کے اندر پایا جاتا ہے۔ جب تم ان ساری چیزوں پر غور کرو گے تو آخر تم اسی نتیجہ پر پہنچو گے کہ خدا تعالیٰ سے محبت ہو سکتی ہے۔

پس اسلام تعلق بِاللہ کو نہ صرف ممکن بلکہ انسان کی اغراضِ پیدائش میں سے

قرار دیتا ہے۔ احادیث میں آتا ہے۔ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لِلّٰهِ اَشَدُّ فَرْحًا بِتَوْبَةِ اَحَدِ كُمْ مِنْ اَحَدِ كُمْ بِضَالَّتِهٖ اِذَا وَجَدَهَا [۱۷] یعنی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے قسم ہے اللہ تعالیٰ کی کہ خدا اپنے بندہ کی توبہ پر اُس شخص سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے جس کی سواری سفر میں گم ہو جائے اور پھر وہ اُسے مل جائے۔ عرب جیسے مُلک میں سفر کی حالت میں اگر کسی شخص کی سواری گم ہو جائے تو تم سمجھ سکتے ہو کہ یہ کتنی خطرناک بات ہے۔ میلوں میل پر ایسے شخص کو نہ پانی مل سکتا ہے نہ کھانے کیلئے کوئی چیز مل سکتی ہے اور نہ کوئی اَور ایسا شخص مل سکتا ہے جو اُسے منزلِ مقصود پر پہنچنے میں مدد دے۔ ایسی حالت میں اگر اُس کی گمشدہ سواری اُسے مل جائے تو جو خوشی ایسے شخص کو ہوسکتی ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اس سے بھی زیادہ خوشی اللہ تعالیٰ کو اُس وقت ہوتی ہے جب اُس کا کوئی بندہ اُس کے حضور توبہ کرتا ہے۔ دیکھو اس میں بھی نہ صرف اللہ تعالیٰ کی محبت کا اظہار کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کو خدا تعالیٰ کی طرف رجوع ہی کے لئے پیدا کیا گیا ہے بلکہ ایک زائد بات بھی اس میں بتائی گئی ہے اور وہ زائد بات یہ ہے کہ ضَالَّةٌ [۱۸] گمشدہ سواری کو کہتے ہیں اور بندے کے توبہ کی مثال گمشدہ سواری سے دینا اپنے اندر یہ حکمت رکھتا ہے کہ انسان خدا تعالیٰ کی سواری ہے جس سے وہ سفر کرتا ہے یعنی اپنی صفات کو دنیا میں جاری کرتا ہے۔ اگر یہ حکمت مدنظر نہ ہوتی تو گمشدہ سواری کی مثال دینے کی بجائے یہ بھی کہا جا سکتا تھا کہ خدا تعالیٰ کو اس سے بھی زیادہ خوشی ہوتی ہے جتنی کسی شخص کو اپنی کھوئی ہوئی دولت کے ملنے سے خوشی ہوتی ہے۔ مثال کے لئے سواری کو

مخصوص کرنا بتا تا ہے کہ انسان بھی اللہ تعالیٰ کی ایک سواری ہے۔ سواری کے معنی اُس چیز کے ہوتے ہیں جس کے ذریعہ سے اُس کا سوار اپنی منزلِ مقصود تک پہنچتا ہے۔ پس جس طرح گدھے اور گھوڑے اور اونٹ کا انسان محتاج ہے اور وہ اُن پر سواری کرتا ہے تا کہ وہ جلد منزلِ مقصود پر پہنچ سکے۔ اِسی طرح خدا بھی اپنے ظہور کے لئے کسی نیک بندے کا محتاج ہوتا ہے۔ وہ انسان اونٹنی بنتا ہے اور خدا اس پر سوار ہوتا ہے اور جس طرح اُسی سواری سے سفر اچھا ہوتا ہے جو سِدھی ہوئی ہو اِسی طرح انسان بھی وہی کام کا ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے سِدھ جائے اور اُس کے اشاروں کو سمجھنے لگے۔ گویا خدا تعالیٰ سے تعلق رکھنے والے کی مثال ایک سواری کی سی ہے جو خدا تعالیٰ کے کام آتی ہے۔ اگر وہ نہ ہوتو اس دنیا سے خدا تعالیٰ روشناس بھی نہ ہو۔ تمثیلی زبان میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے اپنے آپ کو اس بات کا محتاج قرار دیا ہے کہ انسان اُس کی سواری بنے تا کہ دنیا میں اُس کا ظہور ہو اور اُس کی صفات اس عالَم میں ظاہر ہوں۔

غرض قرآن کریم و حدیث سے ثابت ہے کہ انسان کی پیدائش تعلق بِاللہ کے لئے ہے اور یہ کہ تعلق بِاللہ دونوں طرح کا ہوتا ہے۔ بندے کا خدا سے اور خدا کا بندے سے۔ جیسا کہ حدیث بالا میں توبہ پر خدا کی خوشی کا ذکر ہے اور انسان کو خدا تعالیٰ کی سواری قرار دیا گیا ہے۔ نیز اُس حدیث میں بھی اس کا ذکر آتا ہے جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ انسان نوافل کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے قرب میں بڑھتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ خدا اُس کے کان ہو جاتا ہے جن سے وہ سنتا ہے۔ اُس کی آنکھیں ہو جاتا ہے جن سے وہ دیکھتا ہے۔ اس کے ہاتھ ہو جاتا

۱۹ ہے جن سے وہ پکڑتا ہے اور اُس کے پاؤں ہو جاتا ہے جن سے وہ چلتا ہے
اور یہ مقام جس کا ذکر کیا گیا ہے یعنی خدا تعالیٰ سے انسان کا ایسا گہرا تعلق قائم ہو جانا
کہ انسان اُس کی سواری بن جائے اور خدا تعالیٰ کا اپنے بندے کو اس قدر قریب
کرنا کہ اُس کے کان اور اُس کی آنکھیں اور اُس کے ہاتھ اور اُس کے پاؤں اُس
کے نہ رہیں بلکہ خدا تعالیٰ کے بن جائیں ۔ یہ خالی اطاعت و امتثال اور انعام نہیں ہو
سکتے کیونکہ اِن امور کا تعلق فکر سے ہے جذبات سے نہیں ۔ اطاعت ایک فلسفیانہ چیز
ہے اور خدا تعالیٰ کا ملنا ایک حسیاتی چیز ہے ۔ اطاعت اور امتثال محض دماغی کیفیات
سے تعلق رکھنے والی چیزیں ہیں اور خدا تعالیٰ کا اس قدر قریب ہو جانا کہ انسان اُس
کی سواری بن جائے اور خدا اُس کے ہاتھ پاؤں بن جائے یہ دل کے ساتھ تعلق
رکھنے والی چیزیں ہیں اور ظاہر ہے کہ حس وجذبات ایسی چیزیں ہیں جن کا تعلق دائمی
ہوتا ہے اور دماغ ایسی چیز ہے جس کا تعلق عارضی ہوتا ہے تم جاگ رہے ہو تو مکھی
جب تمہارے جسم پر بیٹھنے کے لئے آتی ہے تو تم ہاتھ مارتے ہو تا کہ مکھی تم سے دور
ہو جائے لیکن سوتے ہوئے اگر مکھی تمہارے قریب آتی ہے تو تمہیں رعشہ کا مرض ہو تو
اور بات ہے ورنہ یہ نہیں ہوتا کہ سونے کی حالت میں اُس کے آنے سے پہلے ہی
اُس کو ہٹانے کی کوشش کرو ۔ یا دشمن آتا ہے اور تم پر حملہ کرتا ہے اور پھر تم سو جاتے
ہو تو یہ کہ تم سوتے سوتے یہ سوچتے رہو کہ اگر پھر دشمن تم پر حملہ کر دے تو تم اس کا کس
طرح مقابلہ کرو گے ۔ بلکہ اگر تمہارے سوتے ہوئے گھر میں کوئی دشمن آ جائے اور
تمہاری بیوی یا بیٹا اُس کا مقابلہ کر کے اُسے بھگا دیں تو تم بعد میں شکوہ کرتے ہو اپنے
بیٹے سے یا شکوہ کرتے ہو اپنی بیوی سے کہ تم نے مجھے جگایا کیوں نہیں ورنہ مجھے بھی

پتہ لگ جاتا اور میں بھی تمہاری مدد کرتا۔تو عقلی تعلق صرف جاگتے ہوئے چلتا ہے اور سونے کی حالت میں وہ اتنا کمزور ہو جاتا ہے کہ صرف تحت الشعور ہی میں اُس تعلق کا احساس رہتا ہے اور وہ بھی بہت محدود رنگ میں لیکن جذباتی اور قلبی تعلق ایسا نمایاں ہوتا ہے کہ جاگتے ہوئے بھی اُس کا خیال رہتا ہے اور سوتے ہوئے بھی اُسی کا خیال رہتا ہے۔ چنانچہ دیکھ لو ماں سوتے سوتے اپنے بچہ کو گلے سے چمٹائے رہتی ہے اور سونے کی حالت میں ہی کبھی وہ اسے پیار کرتی ہے کبھی پچکارتی ہے اور کبھی اُسے سینہ سے لگاتی ہے۔ اگر اُسی حالت میں کوئی چور اُس کا مال اُٹھا کر لے جائے تو اُسے خبر بھی نہیں ہوتی کیونکہ مال کا تعلق فکر سے ہے جذبات سے نہیں۔ لیکن بچہ کی محبت سونے کی حالت میں بھی قائم رہتی ہے۔ اِدھر ماں بچہ کو پیار کر رہی ہوتی ہے اور بچہ اپنی ماں کی چھاتیاں منہ میں ڈالے چوس رہا ہوتا ہے اور وہ دونوں سو رہے ہوتے ہیں تو جذبات ہر وقت قائم رہتے ہیں۔ جب یہ پیدا ہو جائیں تو اُن کے لئے جاگنا اور سونا برابر ہوتا ہے لیکن دماغی کیفیتیں جاگتے وقت نمایاں ہوتی ہیں اور سوتے وقت غائب ہو جاتی ہیں اور جب جگاؤ تو اُن کیفیات کو دماغ میں مستحضر کرنے کے لئے ایک فاصلہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً ماں کی آنکھ کھلے تو بچہ کی محبت آنکھ کھلنے کے ساتھ ہی آ جائے گی لیکن گھر میں سانپ نکل آئے اور کسی سوئے ہوئے آدمی کو جگایا جائے تو آنکھ کھلنے پر فوری طور پر اُس کا ذہن خطرہ کی طرف منتقل نہیں ہوتا بلکہ اُسے درمیان کا فاصلہ طے کرنے کے لئے کچھ وقفہ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے لیکن جذبات میں ایک تسلسل چلتا ہے جو سوتے جاگتے ہر وقت قائم رہتا ہے۔

اس تعلق کے اظہار کے لئے عربی زبان میں مختلف الفاظ پائے جاتے ہیں

مثلاً رغبت، شوق، اُنس، وُدّ، محبت، خُلّۃ، عشق۔ اِن کے سوا بعض اَور بھی الفاظ ہیں مگر یہ چند موٹے موٹے الفاظ ہیں جو میں نے چن لئے ہیں۔

شوق اَور عشق

شوق اور عشق کا لفظ قرآن کریم میں استعمال نہیں ہوا، نہ بندے کے خدا سے تعلق کے متعلق استعمال ہوا ہے اور نہ خدا کے بندے سے تعلق کے متعلق استعمال ہوا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان کے لحاظ سے شوق میں وسعت کا مادّہ نہیں پایا جاتا لیکن جو شوق کے معنی ہیں وہ رغبت کے معنوں میں بھی آجاتے ہیں اور پھر رغبت کے لفظ میں عربی زبان کے لحاظ سے وسعت بھی پائی جاتی ہے چونکہ جس شخص سے بھی خدا تعالیٰ کو محبت ہوگی لازماً وہ محبت انسانی محبت سے زیادہ ہوگی اور جس شخص کے دل میں بھی خدا تعالیٰ سے محبت کرنے کا خیال پیدا ہوگا وہ یہی چاہے گا کہ میں سب سے زیادہ خدا تعالیٰ سے محبت کروں۔ یہ نہیں کہ وہ کہے گا میں اتنی محبت کروں گا جتنی مجھے مثلاً اپنی بکری سے ہے یا جتنی محبت مجھے اپنے گھوڑے سے ہے اور شوق میں وسعت نہیں پائی جاتی اِس لئے نہ بندے کے اُس تعلق کے لئے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے جو اُس کا خدا تعالیٰ سے ہوتا ہے اور نہ خدا تعالیٰ کے اس تعلق کے لئے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے جو اُس کا اپنے بندے سے ہوتا ہے۔ شوق کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ہمیں وہ چیز ابھی ملی نہیں جس کی ہمارے دل میں خواہش پائی جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ اس مفہوم کے لحاظ سے خدا تعالیٰ کے لئے یہ لفظ استعمال نہیں ہوسکتا۔ ورنہ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ یہ کہنا پڑے گا کہ خدا تعالیٰ کو بھی بعض چیزوں کی خواہش ہوتی ہے مگر وہ اُسے ملتی نہیں۔ اسی طرح عشق کا لفظ بھی نہ قرآن کریم میں استعمال ہوا ہے اور نہ جہاں تک مجھے علم ہے حدیثوں میں استعمال ہوا ہے۔ نہ اُس تعلق کے اظہار کے لئے جو بندے کا خدا سے ہوتا ہے اور نہ اُس تعلق کے اظہار کے لئے جو خدا کا

اپنے بندے سے ہوتا ہے۔ حالانکہ عشق بڑی شدید محبت کو کہتے ہیں مگر باوجود اس کے کہ نہایت شدید محبت کے لئے عشق کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے پھر بھی خدا تعالیٰ یہ نہیں کہتا کہ تم مجھ سے عشق کرو اور نہ یہ کہتا ہے کہ فلاں بندے کو مجھ سے عشق تھا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عشق کے معنی لغت کی وضع کے لحاظ سے کچھ پسندیدہ معنے نہیں۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ صوفیاء نے یہ لفظ استعمال کیا ہے اور میں جو تردید کر رہا ہوں خود میرے شعروں میں بھی کئی جگہ عشق کا لفظ آیا ہے مگر وہ استعمال اُردو شاعری کے لحاظ سے ہے بحیثیت عربی دان ہونے کے نہیں۔ عربی میں اس لفظ کا استعمال خدا تعالیٰ کے لئے پسندیدہ نہیں سمجھا جاتا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عشق کے معنوں میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ ایسی محبت ہو جو انسان کو ہلاکت تک پہنچا دے اور یہ بات ایسی ہے جو نہ اُس انسان کے متعلق کہی جا سکتی ہے جو خدا تعالیٰ سے محبت کر رہا ہو اور نہ خدا تعالیٰ کے متعلق کہی جا سکتی ہے جو اپنے کسی بندے سے محبت کر رہا ہو۔ خدا تعالیٰ جو منبعِ حیات ہے اُس کے لئے اگر کوئی شخص شدید محبت رکھے گا تو اُس کی محبت بڑھے گی اور ترقی کرے گی اور اُسے ایک نئی زندگی عطا ہوگی۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ خدا تعالیٰ کی محبت اُسے ہلاک کر دے۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کی اُس محبت پر بھی یہ لفظ استعمال نہیں ہوسکتا جو وہ اپنے بندوں سے رکھتا ہے۔ کیونکہ وہ تو خود منبع حیات ہے اور جو فنا نہیں ہو سکتا اُس کے متعلق یہ کہنا کہ محبت اُسے ہلاکت تک پہنچا دے گی بالکل غلط ہوگا۔ پس چونکہ عشق کے معنوں میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ عشق ایسی محبت کو کہتے ہیں جس سے عقل میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے اور رفتہ رفتہ ایسی محبت کرنے والا ہلاکت تک پہنچ جاتا ہے اور یہ چیزیں خدا تعالیٰ کی محبت میں انسان کے اندر پیدا نہیں ہوتیں اور نہ خدا تعالیٰ کی اُس محبت کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہیں جو وہ اپنے بندوں سے رکھتا ہے۔ اِس لئے نہ قرآن میں اور نہ کسی

حدیث صحیح میں بندے اور خدا کی محبت کے لئے عشق کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ میں نے یہ وضاحت اس لئے کی ہے کہ ہمارے مُلک میں عشق کا لفظ انتہائی محبت کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن قرآن اور حدیث میں یہ لفظ استعمال نہیں کیا گیا اور اِس کی وجہ میں نے بتا دی ہے کہ عربی لغت کے لحاظ سے عشق ایسی محبت کو کہتے ہیں جو ہلاکت اور بربادی تک پہنچا دے۔ پس گو عام محاورہ کے لحاظ سے ہم اپنی زبان میں کبھی کبھی کہہ بھی دیتے ہیں فلاں شخص خدا تعالیٰ سے عشق رکھتا ہے لیکن عربی زبان کے لحاظ سے اس لفظ کا استعمال صحیح نہیں ہوتا کیونکہ حقیقت یہی ہے کہ نہ کوئی انسان عقل صحیح سے کام لیتے ہوئے خدا تعالیٰ سے عشق کر سکتا ہے اور نہ کوئی انسان ایسا ہوسکتا ہے جو خدا تعالیٰ سے عشق کرے کیونکہ خدا تعالیٰ کی محبت انسان کو ہلاکت اور بربادی سے بچاتی ہے ہلاکت اور بربادی تک لے جاتی نہیں۔

اب باقی رہ گئے رغبت، اُنس، وُدْ، محبت اور خُلّت کے الفاظ۔ یہ الفاظ کسی جگہ پر بندے کے خدا سے تعلق کی نسبت اور کسی جگہ پر خدا تعالیٰ کے بندے سے تعلق کی نسبت قرآن و حدیث میں استعمال کئے گئے ہیں۔ آگے چل کر میں بیان کروں گا کہ اِن مختلف الفاظ میں کیا حکمت ہے اور ہر لفظ محبت کے کس رنگ یا کس درجہ کو ظاہر کرتا ہے۔

رغبت

سب سے پہلے میں یہ بتاتا ہوں کہ رغبت کے عربی زبان میں کیا معنی ہیں رَغِبَہٗ کے معنی ہوتے ہیں اَرَادَہٗ بِالْحِرْصِ عَلَیْہِ وَاَحَبَّہٗ ۲۰؎ اُس نے ارادہ کیا حرص کے ساتھ اور محبت کے ساتھ اور ایسی محبت کے ساتھ جس میں وسعت پائی جاتی ہے۔ گویا جب ہم کسی کے متعلق یہ کہیں کہ وہ کسی سے رغبت رکھتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ اُس سے محبت رکھتا ہے۔ اُس کا دل چاہتا ہے کہ اُس سے ملے۔ اُس کی چاہت اُس کے دل میں

پائی جاتی ہے اور چاہت بھی معمولی نہیں بلکہ بڑی وسیع ہے۔اب اُردو کے لحاظ سے تو لوگ کہیں گے کہ خوب مضمون ہے جو اِس چھوٹے سے لفظ کے اندر آ گیا۔لیکن عربی زبان کے لحاظ سے محبت کا یہ سب سے چھوٹا مضمون ہے جو اس لفظ کے ذریعہ ادا کیا جاتا ہے۔

غرض رغبت کے معنی ہیں ملاقات کا ارادہ کرنا اور ارادہ بھی کسی اور غرض کے لئے نہ ہو بلکہ محض پیار کے لئے ہو اور وہ ارادہ بھی معمولی نہ ہو بلکہ بہت تیز ہو۔

پھر رَغِبَ اِلَيْهِ کے یہ بھی معنی ہوتے ہیں کہ اِبْتَهَلَ [۲۱] یعنی عجز کرنا اور بہت ہی منکسرانہ طور پر اخلاص اور تضرع سے دعا کرنا۔گویا رغبت کے یہ معنی ہوئے کہ مؤمنوں کا اللہ تعالیٰ سے ایسا تعلق ہو جاتا ہے کہ وہ عجز وانکسار سے اُس کے حضور دعائیں کرتے ہیں۔قرآن کریم میں بھی مؤمنوں کی نسبت یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا [۲۲] مؤمن بندے ہمیں عجز اور انکسار کے ساتھ پکارتے ہیں کیونکہ اُن کے دلوں میں ہماری شدید محبت ہوتی ہے۔ یہاں اس بات کا اقرار کیا گیا ہے کہ نہ صرف یہ کہ انسان خدا تعالیٰ کا محب ہوسکتا ہے بلکہ دنیا میں ایسے لوگ موجود ہیں جن کے دلوں میں خدا تعالیٰ کی محبت ہے۔اور وہ ایسے مقام پر کھڑے ہیں کہ عجز اور انکسار کے ساتھ وہ خدا تعالیٰ کی طرف جھکے ہوتے ہیں۔ اِسی طرح مؤمنوں کی نسبت فرماتا ہے کہ وہ یہ کہا کرتے ہیں کہ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ [۲۳] ہم اللہ تعالیٰ کی طرف راغب ہیں۔ پہلے تھی خدا کی گواہی کہ دنیا میں میرے ایسے بندے موجود ہیں جن کے دلوں میں میری محبت ہے اور محبت بھی تیز اور محبت بھی معرفت والی اور عجز اور انکسار والی۔اب فرماتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے بعض بندے ایسے ہوتے ہیں کہ جب اُنہیں کہا جائے کہ تم کون ہو؟ تو

وہ دھڑلّے سے چیلنج کرتے ہیں لوگوں کو، اور کہتے ہیں کہ ہم خدا سے محبت کرنے والے ہیں۔ جب لوگ اُن کو اپنی طرف بُلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تمہیں دنیا میں مال دیں گے۔ بڑی بڑی نعمتیں دیں گے تو وہ جواب میں کہتے ہیں تم اپنی چیزوں کو اپنے پاس رکھو ہمارا محبوب تو وہ بیٹھا ہے۔ بعض لوگ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ اِس قسم کا دعویٰ کرنا گستاخی اور بے ادبی ہے حالانکہ یہ خیال مذہب کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔

مجھے یاد ہے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں ایک شخص حافظ محمد صاحب پشاور کے رہنے والے تھے۔ قرآن کریم کے حافظ تھے اور سخت جوشیلے احمدی تھے۔ میرا خیال ہے وہ اہلحدیث رہ چکے تھے کیونکہ اُن کے خیالات میں بہت زیادہ سختی پائی جاتی تھی۔ وہ ایک دفعہ جلسہ پر آئے ہوئے تھے اور قادیان سے واپس جا رہے تھے کہ راستہ میں خدا تعالیٰ کی خشیت کی باتیں شروع ہو گئیں۔ کسی شخص نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی شان تو بہت بڑی ہے ہم لوگ تو بالکل ذلیل اور حقیر ہیں پتہ نہیں کہ خدا ہماری نماز بھی قبول کرتا ہے یا نہیں، ہمارے روزے بھی قبول کرتا ہے یا نہیں، ہماری زکوٰۃ اور حج بھی قبول کرتا ہے یا نہیں۔ اس پر ایک دوسرا شخص بولا کہ اللہ تعالیٰ کی بڑی شان ہے میں تو کئی دفعہ سوچتا ہوں کہ میں مؤمن بھی ہوں یا نہیں۔ حافظ محمد صاحب ایک کونہ میں بیٹھے ہوئے تھے وہ یہ باتیں سنتے ہی اُس شخص سے مخاطب ہوئے اور کہنے لگے تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو؟ کیا یہ سمجھتے ہو کہ تم مؤمن ہو یا نہیں؟ اُس نے کہا میں تو یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ میں مؤمن ہوں یا نہیں۔ حافظ محمد صاحب کہنے لگے اچھا اگر یہ بات ہے تو آج سے میں نے تمہارے پیچھے نماز نہیں پڑھنی۔ باقیوں نے کہا حافظ صاحب! اس کی بات ٹھیک ہے ایمان کا

مقام تو بہت ہی بلند ہے۔ کہنے لگے اچھا پھر تم سب کے پیچھے نماز بند۔ جب تم اپنے آپ کو مؤمن ہی نہیں سمجھتے تو تمہارے پیچھے نماز کس طرح ہوسکتی ہے۔ غرض دوست پشاور پہنچے اور حافظ صاحب نے جماعت کے ساتھ نماز پڑھنی چھوڑ دی۔ جب پوچھا گیا تو اُنہوں نے کہا کہ تم تو اپنے آپ کو مؤمن ہی نہیں سمجھتے میں تمہارے پیچھے نماز کس طرح پڑھوں۔ آخر جب فساد بڑھا تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس واقعہ کی اطلاع دی گئی۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا۔ حافظ صاحب ٹھیک کہتے ہیں مگر یہ اُن کی غلطی تھی کہ اُنہوں نے اُن لوگوں کے پیچھے نماز پڑھنی ہی چھوڑ دی کیونکہ اُنہوں نے کفر نہیں کیا تھا لیکن بات ٹھیک ہے۔ ہماری جماعت کے دوستوں کا فرض تھا کہ وہ اپنے آپ پر حسن ظنی کرتے۔ جہاں تک کوشش کا سوال ہے انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنی کوشش جاری رکھے اور نیکیوں میں بڑھنے کی کوشش کرے۔ مگر یہ کہ مؤمن ہونے سے ہی انکار کر دے یہ غلط طریق ہے۔ پس مسئلہ اُن کا ٹھیک ہے لیکن فعل اُن کا غلط ہے۔ انہیں اپنے دوستوں کے پیچھے نماز نہیں چھوڑنی چاہیے تھی۔ صوفیاء نے بھی لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص دیدہ و دانستہ جانتے بوجھتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ میں اپنے نفس کو ٹٹولتا ہوں تو مجھے نظر نہیں آتا کہ اُس میں ایمان پایا جاتا ہے تو وہ کافر ہو جاتا ہے۔ یہی حقیقت اللہ تعالیٰ نے اِس آیت میں بیان فرمائی ہے کہ مؤمن کہتے ہیں اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ۔ ہم خدا تعالیٰ سے محبت کرنے والے ہیں۔ پس مؤمنوں کو سب سے پہلے اپنے آپ پر اعتبار کرنا چاہیئے۔ یہ اَور بات ہے کہ وہ اپنے نفس میں کمزوریاں محسوس کریں اور سمجھیں کہ ابھی اُنہیں اَور زیادہ ترقی کی ضرورت ہے مگر اِس کا علاج یہ ہے کہ وہ اپنے نفس کو

بدلیں۔ اُس کی اصلاح کریں اور کمزوریوں پر غالب آنے کی کوشش کریں۔ اِسی طرح دوسروں سے بھی کہیں کہ دعا کریں اللہ تعالیٰ ہمیں مزید ترقیات عطا فرمائے اور ہماری کمزوریوں پر پردہ ڈالے لیکن جب واقعہ میں اُن کی سمجھ میں آ گیا کہ خدا تعالیٰ ہے اور اُس کے احکام پر عمل کرنا اُن کا فرض ہے تو اُن کے مؤمن ہونے میں کیا شُبہ رہا۔

اِسی طرح سورۃ قلم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مؤمن کہتے ہیں اِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا رَاغِبُوْنَ [۲۴] ہم تو اللہ تعالیٰ کی طرف ہی رغبت رکھتے ہیں۔

مفردات راغب میں جو قرآن کریم کی ایک پُرانی لغت کی کتاب ہے علامہ اصفہانی لکھتے ہیں کہ اَصْلُ الرَّغْبَةِ اَلسَّعَةُ فِی الشَّيْءِ۔ [۲۵] یعنی رغبت کے اصل معنی کسی چیز میں وُسعت پیدا ہو جانے کے ہیں یُقَالُ رَغُبَ الشَّيْءُ اتَّسَعَ۔ [۲۶] عرب کہتے ہیں فلاں چیز رغیب ہوگئی یعنی فلاں چیز بہت وسیع ہوگئی [۲۷] اور کہتے ہیں حَوْضٌ رَغِیْبٌ [۲۸] فلاں حوض بڑا وسیع ہے اور کہتے ہیں فَرَسٌ رَغِیْبُ الْعَدَدِ فلاں گھوڑا بڑے لمبے قدم مار کر چلتا ہے۔ گویا عربی میں رغبت کے اصل معنی وسعت کے ہیں۔ پھر کہتے ہیں اَلرَّغْبَةُ اَلسَّعَةُ فِی الْاِرَادَةِ۔ [۲۹] ارادہ کی وسعت پر بھی رغبت کا لفظ بولا جاتا ہے اور رَغِبَ فِیْهِ وَاِلَیْهِ کے معنی ہیں یَقْتَضِی الْحِرْصَ عَلَیْهِ۔ [۳۰] وہ شدتِ حرص کے ساتھ اس چیز کو طلب کرتا ہے۔ گویا کسی چیز کی طلب کی وُسعت اور اس کے حصول کے لئے خواہش کی شدت کو رغبت کہا جاتا ہے۔ پس خدا تعالیٰ کی رغبت کے معنی یہ ہیں کہ اس کے ملنے کی زبردست اور وسیع خواہش انسان کے دل میں پیدا ہو جائے۔

دوسرا لفظ اُنس ہے۔ اَنِسَ یَأْنَسُ کے معنی ہوتے ہیں اَلِفَهٗ [۳۱] اُس چیز سے اُلفت ہوگئی وَسَکَنَ قَلْبُهٗ بِهٖ [۳۲] اور اُس چیز کے ملنے سے دل کو تسکین ہوگئی گویا اُنس کے معنی ہیں وہ چیز جس کی جستجو تھی مل جائے اور اُس کے ملنے سے دل کی گھبراہٹ دور ہوجائے۔ وَلَمْ یَنْفِرْ مِنْهُ [۳۳] اور جس کے پاس آنے سے وحشت پیدا نہ ہو۔ جیسے اگر کوئی غیر آ کر بیٹھ جائے تو انسان چاہتا ہے کہ وہ جلدی اُٹھ جائے لیکن اگر کوئی بے تکلف دوست آ بیٹھے یا بیوی کام کرتے ہوئے آ جائے یا بچہ ملنے کے لئے آ جائے اور تھوڑی دیر کے بعد جانے لگے تو انسان کہتا ہے کہ ابھی کچھ اور بیٹھو اتنی جلدی کیوں چلے ہو۔ یہ اُنس کی علامت ہوتی ہے لیکن جس سے وحشت ہوتی ہے انسان کا دل چاہتا ہے کہ وہ جلدی علیحدہ ہوجائے۔ اِسی لئے لغت میں لکھا ہے۔ اَلْاُنْسُ ضِدُّ الْوَحْشَةِ۔ [۳۴] اُنس وحشت کی ضد کو کہتے ہیں۔ پھر لکھا ہے اَلْاِنْسُ خِلَافُ الْجِنِّ۔ [۳۵] اِنس جن کے خلاف اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے۔ وَالْاُنْسُ خِلَافُ النُّفُوْرِ [۳۶] اور اُنس، نفور کے خلاف چیز ہے۔ کہتے ہیں مجھے فلاں سے اُنس ہے یعنی مجھے اُس سے نفرت نہیں۔ وَالْاِنْسِیُّ مَنْسُوْبٌ اِلَی الْاُنْسِ یُقَالُ ذٰلِکَ لِمَنْ کَثُرَ اُنْسُهٗ [۳۷] اور اِنْسِیٌّ کے معنی ہوتے ہیں انسانوں سے تعلق رکھنے والی چیز خصوصاً جس چیز کا زیادہ اُنس ہو یا جو چیز زیادہ اُنس کرے اُسے اِنْسِیٌّ کہتے ہیں۔ وَلِکُلِّ مَایُؤْنَسُ بِهٖ [۳۸] اور جس کے ساتھ تعلق ہو اُسے بھی اِنْسِیٌّ کہتے ہیں۔ وَلِهٰذَا قِیْلَ اِنْسِیُّ الدَّابَّةِ لِلْجَانِبِ الَّذِیْ یَلِی الرَّاکِب [۳۹] اسی لئے گھوڑے کی وہ جانب جو سوار کی طرف ہو اُسے اِنْسِیُّ الدَّابَّةِ کہیں گے۔ مثلاً اِس وقت میرے سامنے لاؤڈ سپیکر پڑا ہے اِس کا ایک حصہ میری طرف ہے اور دوسرا

حصہ آپ لوگوں کی طرف ۔ یہ حصہ میرا اِنْسِی ہے اور وہ حصہ آپ لوگوں کا اِنْسِی ہے۔ گویا جو حصہ کسی کی طرف جھکتا ہو اور اس سے ملتا ہو اُسے اِنْسِی کہیں گے وَالْاِنْسِیُّ مِنْ کُلِّ شَیْئٍ مَایَلِی الْاِنْسَان [۴۰] اور ہر وہ چیز جس کا انسان کی طرف منہ ہوتا ہے اُسے اِنْسِی کہتے ہیں ۔

اس تشریح سے ظاہر ہے کہ جہاں رغبت کے معنی وُسعتِ تعلق کے ہیں وہاں اُنس کے معنی صرف رغبت کے نہیں بلکہ اس کے یہ بھی معنی ہیں کہ وہ چیز قریب بھی آ گئی ہے اور اُس نے اپنا منہ اِدھر کرلیا ہے۔ پس اُنس دل کی تسلی اور قرب پر دلالت کرتا ہے۔ خالی شوق سے نہ دل کی تسلی ہوتی ہے اور نہ اپنے محبوب کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح رغبت صرف یہ دلالت کرتی تھی کہ مجھے اُس کے ساتھ محبت ہے لیکن اُنس اس پر دلالت کرتا ہے کہ میری محبت نے اُس کا منہ بھی میری طرف پھیر دیا ہے اور چونکہ اُس کا منہ میری طرف ہوگیا ہے اِس لئے میرے دل کو تسلی ہوگئی ہے اور گھبراہٹ جاتی رہی ہے۔قرآن کریم میں آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جا رہے تھے کہ اُنہوں نے ایک آگ دیکھی اور اپنے اہل سے کہا کہ اِنِّیْ اٰنَسْتُ نَارًا [۴۱] ایک آگ کو دیکھ کر میرے دل نے تسلی پائی ہے۔ چونکہ اُنَس کے اصلی معنی قرب اور تسلی کے ہیں۔ ایناس دیکھنے اور سننے کے معنوں میں بھی آتا ہے کیونکہ دیکھی اور سنی وہی چیز جاتی ہے جو قریب ہو جاتی ہے پس اٰنَسْتُ ناراً کے معنی یہ ہیں کہ مجھے آگ کی تلاش تھی اب ایک قسم کی آگ مجھے نظر آئی ہے اور میرے دل کو تسلی ہوگئی ہے کہ میری ضرورت پوری ہوگئی ۔

تیسرا لفظ وُدّ ہے۔ وُدّ اُس محبت کو کہتے ہیں جس کے ساتھ تمنّی بھی ہو یعنی

صرف محبت ہی نہ ہو بلکہ اُس کے ساتھ تمنّی اور خواہش بھی پائی جاتی ہو کہ وہ چیز مجھے مل جائے ۔ گویا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لو کہ لَو لگ جائے ۔ یہ لفظ **وَدّ** کی شکل میں بھی استعمال ہوتا ہے، وِدّ کی شکل میں بھی اور وُدّ کی شکل میں بھی ۔ اور تینوں شکلوں میں محبت کے معنوں میں ہی آتا ہے ۔ اِس کے معنی محبت کے بھی ہیں اور بہت محبت کے بھی ہیں ۔ اِس کے معنوں کی حقیقت اس طرح واضح ہوتی ہے کہ وَدّ عربی زبان میں وَتَدٌ [۴۲] یعنی میخ کو بھی کہتے ہیں ۔ اِس وجہ سے کہ اُس کے ذریعہ سے جانور کو زمین کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے ۔ گویا وُدّ ایسی محبت کا نام ہے جو محب اور محبوب دونوں کو اس طرح جوڑ دیتی ہے جیسے کیلا گاڑ کر جانور کو باندھ دیتے ہیں اور وہ زمین کے ساتھ متعلق ہو جاتا ہے ۔ رغبت کے معنی یہ تھے کہ میرے دل میں شوق پیدا ہو گیا ہے اگلے کا پتہ نہیں کہ اُس کے دل میں بھی کوئی شوق پیدا ہوا ہے یا نہیں ۔ اُنس کے یہ معنی تھے کہ میرے دل میں بھی شوق پیدا ہو گیا ہے اور اگلے کے دل پر بھی میری محبت کا اتنا اثر ہو چکا ہے کہ اُس نے اپنا منہ میری طرف کر لیا ہے اور وُدّ کے یہ معنی ہیں کہ صرف اُس نے منہ ہی نہیں کیا بلکہ محبت نے ہماری آپس میں گرہ باندھ دی ہے ۔ پس وُدّ وہ محبت ہے جو گہرا اور مضبوط تعلق پیدا کر دے اور ایک کو دوسرے سے وابستہ کر دے ۔

رغبت اور اُنس کے الفاظ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کی نسبت نہیں آتے ۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ جب ملنے کی خواہش کرے گا تو وہ پوری بھی ہو جائے گی اور رغبت کا لفظ خواہش کے پورا ہونے پر دلالت نہیں کرتا ۔ اِسی طرح اُنس کا لفظ بھی اللہ تعالیٰ کی نسبت استعمال نہیں ہوتا کیونکہ اُنس کے یہ معنی ہیں کہ محبت ہے

اور دیدار بھی ہو گیا لیکن اُسے قریب نہیں لا سکا اور اللہ تعالیٰ کی محبت ایسی ہوتی ہے کہ اس میں بندے کے الگ رہنے کا سوال ہی نہیں ہوتا۔ جب وہ کسی سے محبت کرتا ہے تو اُسے خود اپنے قرب میں کھینچ لیتا ہے جیسے مقناطیس لوہے کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ پس چونکہ خدا اپنے مقربین کو خود اپنی طرف کھینچتا ہے اِس لئے خدا تعالیٰ کے متعلق اُنس کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا۔ اُنس صرف بندے کے اندر ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں جو کفار کے بتوں کے نام آئے ہیں اُن میں سے ایک بت کا نام وَدْ [۴۳] بھی آیا ہے۔ کیونکہ مشرکین کا خیال تھا کہ اِس بُت کا خدا تعالیٰ سے ایسا ہی تعلق ہے جیسے کیلے کا زمین سے ہوتا ہے۔ اِسی طرح مؤمنوں کے متعلق فرماتا ہے سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا [۴۴] خدا اُن کے لئے وُدْ پیدا کردے گا قرآن کریم کی یہ خوبی ہے کہ وہ بعض جگہ ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جن کو چکر دے کر کئی کئی مضامین نکل آتے ہیں۔ یہاں بھی اسی قسم کا طریق اختیار کیا گیا ہے۔ اِس جگہ لَهُمُ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی ہیں اُن کے فائدہ کے لئے کیونکہ لام فائدہ کے لئے آتا ہے مگر یہ کہ کس کس امر کے متعلق وُدْ پیدا کرے گا اسے اللہ تعالیٰ نے مبہم رکھا ہے تا کہ جتنے معانی پیدا ہو سکتے ہوں وہ اس ایک لفظ سے ہی پیدا ہو جائیں۔ اس نقطۂ نگاہ سے جب ہم غور کرتے ہیں تو سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا کے ایک تو یہ معنی بنتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کے لئے اُن کے دلوں میں وُدْ پیدا کرے گا یعنی بنی نوع انسان کی خیر خواہی کا جذبہ اُن کے دلوں میں پیدا ہوگا اور وہ مخلوق کی ہمدردی اور اُن کی بہتری اور ترقی کے جذبہ سے سرشار ہو کر اُن کی خدمت میں مشغول ہو جائیں گے۔

پھر انسان کو اس امر کی بھی ضرورت ہوتی ہے کہ اُس کے دل میں خدا تعالیٰ کی محبت ہو۔ اس لحاظ سے سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا کے یہ معنی ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ اُن کے دلوں میں اپنی محبت پیدا کر دے گا۔

پھر انسان یہ چاہتا ہے کہ نہ صرف اُس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت ہو بلکہ خدا بھی اپنی محبت کا اُسے مورد بنا لے اور اُسے اپنے خاص فضلوں میں سے حصہ دے۔ اس لحاظ سے سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا کے یہ معنی ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نفس میں اُن کی محبت پیدا کر دے گا اور اُن کو اپنی محبت کا مورد بنا لے گا۔

پھر انسان کو اس امر کی بھی ضرورت ہوتی ہے کہ اُس کے رشتہ داروں اور عزیزوں اور دوستوں میں اُس کی عزت ہو۔ اسی طرح وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اپنے شہر اور مُلک والوں میں اُسے نیک نامی حاصل ہو۔ انسان کی اس خواہش کو بھی سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا میں پورا کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ لوگوں کے دلوں میں بھی اُن کی محبت ڈالے گا۔ گویا ہر پہلو کے لحاظ سے اس محبت کو کامل کیا گیا ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ خدا سے مجھ کو محبت ہو جائے۔ انسان چاہتا ہے کہ خدا کو اُس سے محبت ہو جائے۔ انسان چاہتا ہے کہ بنی نوع انسان اُس سے محبت کرنے لگیں اور انسان چاہتا ہے کہ بنی نوع انسان کی محبت اُس کے دل میں پیدا ہو جائے اور یہ چاروں محبتیں سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا کی آیت کی رُو سے مؤمنوں کو حاصل ہوتی ہیں۔ اگر خدا تعالیٰ اِن الفاظ کی بجائے صرف اتنا فرماتا کہ میں اُن سے محبت کروں گا تو ایک معنی تو آ جاتے مگر تین معنی رہ جاتے۔ اگر یہ فرماتا کہ وہ بھی مجھ سے محبت کریں گے اور میں بھی اُن سے محبت کروں گا تو دو معنی آ جاتے

اور دو رہ جاتے ۔ اگر فرماتا کہ میں اُنہیں نیک شہرت دوں گا تو ایک معنی آ جاتے اور تین رہ جاتے ۔ اگر فرماتا کہ میں اُنہیں نیک شہرت بھی دوں گا ، اُن کے دلوں میں اپنی محبت بھی پیدا کروں گا اور اپنی محبت کا بھی اُنہیں مورِد بناؤں گا تب بھی تین معنی آ جاتے اور چوتھے معنی جو شفقت علی النّاس سے تعلق رکھتے ہیں وہ رہ جاتے ۔ اب اللہ تعالیٰ نے آیت ایک رکھی ہے مگر معنی چاروں کے چاروں اس میں آ گئے ہیں ۔ یہ معنی بھی اِس میں آ گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اُن کے دلوں میں اپنی محبت پیدا کرے گا ۔ یہ معنی بھی اس میں آ گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اُنہیں اپنی محبت کا مورد بنائے گا ۔ یہ معنی بھی اس میں آ گئے ہیں کہ بنی نوع انسان کے دلوں میں اُن کی محبت پیدا کرے گا اور یہ معنی بھی اس میں آ گئے ہیں کہ بنی نوع انسان کی محبت اُن کے دلوں میں پیدا کر دے گا یعنی شفقت علی الناس کے لحاظ سے بھی اُنہیں ایک نمونہ بنا دے گا گویا وہ دنیا میں بھی مقبول ہوں گے اور آخرت میں بھی مقبول ہونگے ۔ وہ محبوب ہوں گے بنی نوع انسان کی نگاہ میں اور محبوب ہوں گے خدا تعالیٰ کی نگاہ میں ۔ یہ چار مطالب ایک چھوٹے سے فقرہ میں اللہ تعالیٰ نے ادا کر دیئے ہیں ۔

اِسی طرح اللہ تعالیٰ کی نسبت قرآن کریم میں آتا ہے **اِنَّ رَبِّیْ رَحِیْمٌ وَّدُوْدٌ** [۴۵] میرا ربّ رحیم اور ودُود ہے ۔ یہ یاد رکھنا چاہیے خدا راغب نہیں ہوتا کیونکہ رغبت میں ناقص محبت ہوتی ہے ۔ خدا انیس نہیں ہوتا کیونکہ انیس بھی محبت کے لحاظ سے ناقص ہوتا ہے ۔ خدا ودُود ہوتا ہے ۔ ودُود کے معنی ہیں بہت محبت کرنے والا ۔ گویا خدا یہ بتاتا ہے کہ میں خالی وَادٌّ (وَادِدٌ) نہیں بلکہ وَدُود ہوں ۔ میں بہت محبت کرنے والا نہیں بلکہ بہت بہت محبت کرنے والا ہوں ۔

پھر سورۃ بروج میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے **وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ** [46] خدا بڑا غفور اور وَدُود ہے۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے راغب اور اِنس کا لفظ قرآن کریم میں خدا تعالیٰ کے لئے استعمال نہیں ہوا کیونکہ رغبت اور اُنس کمزور یا معمولی تعلق پر دلالت کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا تعلق کمزور یا معمولی نہیں ہوا کرتا۔ بندے کا تعلق تو کمزور ہوسکتا ہے لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ خدا تعالیٰ کا تعلق کمزور ہو جیسے ماں کا تعلق اولاد سے ہمیشہ شدید ہوتا ہے لیکن اولاد اکثر بے پرواہ ہوتی ہے اور کچھ ہی ہوتے ہیں جو اپنی ماں کا حق ادا کرتے ہیں۔ بہرحال خدا تعالیٰ کے متعلق رغبت اور اُنس کے لفظ استعمال نہیں ہوتے۔ صرف وُدّ کا لفظ استعمال ہوا ہے جو اِن دو سے زیادہ طاقتور ہے اور وُدّ کا بھی صیغہ فاعل استعمال نہیں ہوا۔ صیغہ فعول استعمال ہوا ہے جو شدت اور وسعت پر دلالت کرتا ہے۔

ممکن ہے کوئی کہے کہ جب یہ لفظ ناقص ہیں تو انسان کی نسبت کیوں استعمال ہوتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ انسان خود ناقص ہے اور ناقص محبت کر سکتا ہے بلکہ عام طور پر اُس کے دل میں ناقص صورت میں ہی محبت پیدا ہوتی ہے اس لئے انسان کی نسبت یہ الفاظ استعمال ہو سکتے ہیں لیکن چونکہ خدا تعالیٰ کامل ہے اور وہ جب کرے گا کامل محبت ہی کرے گا اس لئے وہ الفاظ جو ناقص محبت پر دلالت کرتے ہیں خدا تعالیٰ کی نسبت استعمال نہیں ہو سکتے۔ خدا تعالیٰ جب بھی اپنے کسی بندہ سے محبت شروع کرے گا اُس کا پہلا درجہ وُدّ سے شروع ہوگا۔ یعنی اگر کسی میں خدا تعالیٰ کی طرف رغبت پائی جاتی ہے تو خدا تعالیٰ اُس کی محبت کا جواب رغبت کی شکل میں نہیں بلکہ وُدّ کی شکل میں دے گا۔ اِسی طرح اگر کسی شخص میں خدا تعالیٰ کی

طرف اُنس پایا جائے گا تو خدا تعالیٰ اُنس کی شکل میں اُس کی محبت کا جواب نہیں دے گا بلکہ وُ دْ کی شکل میں اُس کی محبت کا جواب دے گا۔ جیسے ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص دوسرے کو اپنی محبت کے اظہار کے طور پر ایک روپیہ دے اور وہ ایک روپیہ کی بجائے چار روپے دے دے۔ اِسی طرح خدا تعالیٰ جب بھی اپنے کسی بندہ کی محبت کا جواب دے گا تو وُ دْ کی صورت میں دے گا۔ انسان محبت شروع کرے گا تو رغبت سے شروع کرے گا پھر اُنس کرے گا اور پھر وُ دْ کرے گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ جب بھی اپنی محبت کا اظہار شروع کرے گا تو وُ دْ سے شروع کرے گا اور وُ دْ کی صورت میں واد ہو کر نہیں وَ دُود کی صورت میں محبت کرے گا۔ انسان کی نسبت جو وُ دْ کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس میں ایک رنگ کی تربیت پائی جاتی ہے یعنی وُ دْ کا مقام تقاضا کرتا ہے کہ انسان کا اللہ تعالیٰ سے ایسا گہرا تعلق ہو جائے کہ وہ اُس کی چیز کہلانے لگ جائے۔ جیسے کہتے ہیں کہ یہ فلاں طویلے [۴۷] کی بکری ہے یہ فلاں طویلے کا گھوڑا ہے۔ وُ دْ کا مقام بھی اُس وقت شروع ہوتا ہے جب انسان خدا تعالیٰ کی طرف منسوب ہونے لگے اور جب وہ اُس کی طرف منسوب ہونے لگے تو وہ اُس کی تربیت شروع کر دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں تَزَوَّجُوا الْوَلُوْ دَالْوَدُوْدَ فَاِنِّیْ مُکَاثِرٌ بِکُمْ [۴۸] تم ایسی عورتوں سے شادیاں کرو جو بہت بچے جننے والی اور وَدُود ہوں۔ کیوں ایسا کرو؟ آپ فرماتے ہیں کہ اس لئے کہ قیامت کے دن میں دوسری اُمتوں کے مقابلہ میں فخر کروں گا کہ میری اُمت سب سے زیادہ ہے اور وہ زیادہ تبھی ہو سکتے ہیں جب عورتیں زیادہ بچے پیدا کرنے والی ہوں اور فخر تبھی کر سکتا ہوں جب وہ بچے اعلیٰ اخلاق اور روحانیت والے ہوں۔

پس تم وَلُوْد عورتوں سے شادیاں کرو جو زیادہ بچے جنیں اور وُدود عورتوں سے شادیاں کرو جو ہر وقت محبت اور پیار سے اولاد کی نگرانی کرنے والیاں ہوں تا کہ قیامت کے دن میں فخر کر سکوں کہ میری اُمت تم سب سے اچھی ہے بلحاظ تعدادِ افراد کے بھی اور بلحاظ تربیت افراد کے بھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ وُدود میں تربیت کے معنی بھی پائے جاتے ہیں۔ اگر تربیت کے معنی اس میں نہ پائے جاتے ہوں تو قیامت کے دن دوسری اُمتوں کے مقابلہ میں فخر کی کوئی صورت ہی نہیں رہتی۔ فخر تو اِسی صورت میں ہوسکتا ہے جب اُمت محمدیہ کے افراد کی تعداد بھی زیادہ ہو اور اُن کی تربیت بھی اچھی ہو اور وہ اسلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام پر عمل کرنے والے ہوں۔ غرض وَدُوْداً کے معنی دائمی محبت سے پُر اور گہرا تعلق رکھنے والے کے ہیں جس کا لازمی نتیجہ عمدہ تربیت ہوتی ہے۔

حُبّ

چوتھا لفظ حُبّ ہے۔ اصل میں یہ حَبَبَ، یَحْبِبُ ہے جو مدغم ہو کر حَبَّ یَحِبُّ ہو گیا۔ اِس کے معنی کسی چیز کے اندر گھس جانے کے یا اپنے اندر لے لینے کے ہیں۔ انہی معنوں میں اَحَبَّ کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے چونکہ محبت کامل کی حقیقت یہ ہوتی ہے کہ یہ اُس کے دل میں داخل ہو جائے اور وہ اس کے دل میں داخل ہو جائے۔ اس لئے اِسی کیفیت کے لئے حَبَّ یا اَحَبَّ کا لفظ عربی میں استعمال کیا جانے لگا اور یہ لفظ وُدّ سے زیادہ مضبوط ہے کیونکہ وُدّ میں صرف ایک وجود کے دوسرے کے اندر گھسنے کا مفہوم ہے جیسا کہ کِیلا زمین میں گھس گیا لیکن حَبَّ میں دونوں وجودوں کے ایک دوسرے کے اندر گھس جانے کا اشارہ پایا جاتا ہے۔ نیز اس کے معنوں میں پھولنے اور بڑھنے کے معنی بھی پائے جاتے ہیں گو عربی میں اس

کیفیت کے لئے حَبَّ اور اَحَبَّ دونوں لفظ استعمال کرتے ہیں لیکن اسمِ فاعل کے لئے عام طور پر مُحِبّ کا لفظ ہی مستعمل ہے جو اَحَبَّ سے بنا ہے۔

چونکہ حُبّ کے اصل معنی کسی چیز کے اندر گھس جانے یا اُسے اپنے اندر لے لینے کے ہوتے ہیں اِس لئے بُلبلہ جو پانی میں اُٹھتا ہے اُسے بھی حُبَابْ کہتے ہیں کیونکہ اُس کے اندر ہوا بھری ہوئی ہوتی ہے۔ گویا پانی جب ہوا کو اپنے اندر لے لیتا ہے تو وہ حُبَابْ کہلانے لگتا ہے اور جب اُگنے والے مادہ کو کوئی چھلکا اپنے اندر لے لیتا ہے تو اُسے حَبْ کہتے ہیں کیونکہ پودا اُس میں چھپا ہوا ہوتا ہے۔ اسی طرح حب عربی زبان میں اُس گھڑے کو بھی کہتے ہیں جس میں چیزیں بھرتے ہیں۔ اب تو ہر جگہ ٹرنکوں وغیرہ کا رواج ہے لیکن پُرانے زمانہ میں گھڑوں میں مختلف چیزیں رکھی جاتی تھیں کسی میں شکر ڈال دی جاتی۔ کسی میں گڑ ڈال دیا جاتا۔ کسی میں دانے ڈال دیئے جاتے۔ کسی میں دالیں وغیرہ رکھ لی جاتیں بلکہ بعض زمینداروں کے گھروں میں تو کپڑے بھی گھڑوں میں ہی رکھے ہوئے ہوتے تھے۔ ایسے گھڑوں کے لئے بھی عربی زبان میں حُبّ کا لفظ استعمال ہوتا ہے یعنی وہ مٹی کے برتن جن میں عورتیں اپنا سامان رکھتی ہیں۔ پس جب وہ جذبہ انسان کے اندر پیدا ہو جو دوسرے کو اپنے دل میں لے لے یا آپ اُس میں گھس جائے تو اُسے حُبّ کہتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ اُردو زبان میں اِس قسم کا کوئی فرق نہیں کیا گیا۔ ہماری زبان میں دو ہی لفظ ہیں یا محبت یا عشق۔ حالانکہ اگر وُدّ کی جگہ محبت بولو تو غلط ہوگا اور اگر اُنس کی جگہ محبت کا لفظ بولو تب بھی غلط ہوگا اور اگر رغبت کو محبت کا مترادف قرار دو تب بھی غلط ہوگا کیونکہ عربی زبان کے لحاظ سے حُبّ اُس جذبۂ محبت کا نام

ہے جس میں انسان کے اس جذبہ کو اتنی تقویت حاصل ہو جائے کہ جس وجود سے وہ محبت کرتا ہے وہ اس کے دل میں گھس جائے اور یہ اس کے دل میں گھس جائے۔ رغبت کے معنی صرف یہ تھے کہ یہ اُدھر جانا چاہتا ہے لیکن ممکن ہے یہ اُدھر جانا چاہے اور وہ مطلوب وجود اور آگے چلا جائے۔ اُنس کے معنی یہ تھے کہ اِس نے ایک وجود کی طرف توجہ کی اور اُس پر بھی اثر ہوا اور وہ اس کی طرف مُڑا۔ لیکن ابھی دونوں قریب نہیں آئے بلکہ جیسے ہم سورج کو دیکھ رہے ہوتے ہیں یا قطب کو دیکھ رہے ہوتے ہیں اِسی طرح وہ آمنے سامنے ہو گئے ہیں۔ پھر وُدّ کا مقام آیا اِس مقام میں یہ اُس کے اندر اور وہ اس کے اندر نہیں گھسا لیکن اِس کا اُس کے ساتھ ایک واسطہ ہو گیا جیسے کِیلا زمین میں گاڑ کر گھوڑے کو اُس کے ساتھ باندھ دیا جائے تو گھوڑا زمین میں نہیں گھستا نہ زمین گھوڑے میں گھستی ہے لیکن کِیلے کے واسطہ سے اُس کا زمین کے ساتھ تعلق ہو جاتا ہے۔ اِس کے بعد حُبّ کا مقام آتا ہے۔ وُدّ میں ایک واسطہ اور تعلق تو ہو چکا تھا لیکن ابھی وہ دُور دُور تھے حُبّ کے مقام پر پہنچ کر یہ اُس وجود میں گھس گیا اور وہ وجود اِس میں گھس گیا۔

دوسرے محبت اُس تعلق کو کہتے ہیں جو نتیجہ خیز ہو اور ایک کھیتی پیدا کر دے کیونکہ حَبّ کے معنی اُس بیج کے ہوتے ہیں جس سے بڑے بڑے درخت اور کھیتیاں پیدا ہو جائیں گویا محبت حقیقی بھی وہی ہے جو دانے کی طرح ہو۔ جس طرح دانے سے درخت پیدا ہو جاتے ہیں اسی طرح محبت بھی اپنے پھل پیدا کئے بغیر نہیں رہتی۔ گویا یوں کہو کہ بندے اور خدا کا تعلق ایسا ہوتا ہے جیسے مرد اور عورت کا ہوتا ہے۔ جب انسان محبت کے مقام پر پہنچ جاتا ہے تو اُس کی روحانی نسل دنیا میں پھیلنی

شروع ہو جاتی ہے اور لوگ اُس پر ایمان لانا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ لفظ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کی نسبت بھی آتا ہے اور مؤمنوں کی نسبت بھی آتا ہے جس طرح وُدّ کا لفظ بھی دونوں کے متعلق استعمال ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَنۡ يَّرۡتَدَّ مِنۡكُمۡ عَنۡ دِيۡنِهٖ فَسَوۡفَ يَاۡتِى اللّٰهُ بِقَوۡمٍ يُّحِبُّهُمۡ وَيُحِبُّوۡنَهٗۤ [۴۹] اے مومنو! تم میں سے جو شخص اپنے دین سے پھر جائے گا۔ فَسَوۡفَ يَاۡتِى اللّٰهُ بِقَوۡمٍ تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ ضرور کسی دوسری قوم کے افراد کو آگے لے آئے گا۔ يُّحِبُّهُمۡ وَيُحِبُّوۡنَهٗۤ اللہ تعالیٰ اُن سے محبت کرے گا اور وہ خدا سے محبت کریں گے پس یہ کہنا بھی درست ہے کہ فلاں شخص خدا سے محبت کرتا ہے اور یہ کہنا بھی جائز ہے کہ فلاں سے خدا محبت کرتا ہے کیونکہ مذکورہ بالا مؤمنوں کے متعلق خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ خدا سے محبت کریں گے اور خدا اُن سے محبت کرے گا۔

اِسی طرح فرماتا ہے وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ أَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا أَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ [۵۰] یعنی دنیا میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو بعض غیر از خدا وجودوں کو اللہ تعالیٰ کے برابر مانتے ہیں اور وہ خدا تعالیٰ کے اِن شریکوں سے ویسی ہی محبت کرتے ہیں جیسی کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرنی چاہیے لیکن مؤمنوں کی جماعت سب چیزوں سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتی ہے۔ اِس آیت میں یہ بھی بتا دیا کہ ایسے مؤمن لوگ فی الواقع موجود ہیں جو خدا تعالیٰ سے سب سے زیادہ محبت کرنے والے ہیں۔ پہلی آیت میں یہ مضمون تھا کہ خدا تعالیٰ ایک ایسی قوم کو آگے لے آئے گا جو خدا تعالیٰ سے محبت

کرنے والی ہوگی اور خدا تعالیٰ اُس سے محبت کرنے والا ہوگا اور ہوسکتا تھا کہ کوئی شخص یہ بات سُن کر کہہ دے کہ یہ تو ایک خیالی بات ہے مرتد ہونے والے مرتد ہو گئے اور اب اپنے دل کو خوش کرنے کے لئے یہ کہا جا رہا ہے کہ اُن کے بدلے میں اللہ تعالیٰ ایک قوم کو ہماری طرف لے آئے گا۔ پس چونکہ لوگ یہ کہہ سکتے تھے کہ یہ ایک خیالی بات ہے ہم اسے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں اِس لئے اِسی آیت میں موجودہ مؤمنوں کی نسبت فرماتا ہے کہ کافر ومشرک تو خدا تعالیٰ کے شریک قرار دے کر اُن سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی خدا سے کرنی چاہیے لیکن ہمارے مؤمن بندے ایسے ہیں جو فی الواقع سب سے زیادہ خدا تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں۔ واقعات سے بھی ثابت ہے کہ صحابہؓ میں ایسے لوگ موجود تھے جو تمام دوسری چیزوں سے زیادہ خدا تعالیٰ سے محبت کرتے تھے۔ اسی طرح فرماتا ہے قُلْ إِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَأَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِأَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ [۵۱] کہہ دے اگر تمہارے باپ دادے اور تمہارے بیٹے اور تمہاری بیٹیاں اور تمہارے بھائی اور تمہاری بہنیں اور تمہاری بیویاں یا تمہارے خاوند اور تمہارے قبیلہ کے لوگ اور تمہاری قوم کے لوگ اور تمہارے مال جو تم محنت سے کماتے ہو اور تمہاری تجارتیں جو خطرہ کی حالت میں ہوتی ہیں اور اگر تم ذرا بھی توجہ ہٹاؤ تو اُن تجارتوں کے تباہ ہونے کا خطرہ ہوتا ہے (تاجر پر بعض دن ایسے آتے

ہیں کہ اگر وہ سارا کام نوکروں پر چھوڑ کر کہیں باہر چلا جائے یا ذرا بھی غفلت سے کام لے تو ساری تجارت تباہ ہو جاتی ہے) اور وہ مکان جو تم کو بہت بھاتے ہیں تم کو خدا اور اُس کے رسول سے زیادہ پسند ہیں تو تم انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ آ جائے اور یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ فاسق قوم کو کبھی کامیاب نہیں کرتا۔

اِس آیت میں بتایا گیا ہے کہ صحابہؓ کی جماعت عملاً خدا تعالیٰ سے محبت کرنے والی تھی اور محبت بھی ایسی کامل رکھتی تھی کہ اُس کے مقابلہ میں نہ ماں باپ کی محبت ٹھہرتی تھی اور نہ بیٹوں کی محبت ٹھہرتی تھی نہ بھائیوں کی محبت ٹھہرتی تھی نہ بیویوں کی محبت ٹھہرتی تھی نہ قبیلہ اور قوم کی محبت ٹھہرتی تھی، نہ مال اور تجارت کی محبت ٹھہرتی تھی اور نہ جائدادوں اور مکانوں کی محبت ٹھہرتی تھی۔ حدیثوں میں آتا ہے لَایُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُهٗ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِمَّا سِوَاھُمَا [۵۲] کوئی تم میں سے ایمان والا نہیں کہلا سکتا جب تک کہ اللہ اور اُس کا رسول اُس کو باقی سب چیزوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جائے۔

اِسی طرح بعض اور حدیثوں میں آتا ہے کہ ایک شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اُس نے کہا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ! میں آپ سے بڑی محبت کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کتنی؟ اُس نے کہا جتنی مجھے اپنے بچوں سے محبت ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو پھر تم مؤمن نہیں ہو سکتے۔ ایمان کے لئے اس سے زیادہ محبت کی ضرورت ہے۔ اُس نے کہا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ! میں آپ سے اپنی جان جتنی محبت رکھتا ہوں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اب بھی تم مؤمن نہیں ہو سکتے کیونکہ ایمان کے لئے اس سے زیادہ محبت کی ضرورت ہے۔ اُس نے کہا یَا

رَسُوْلَ اللّٰہ! میں آپ سے اپنی جان اور اپنے مال اور اپنے بیوی بچوں سے بھی زیادہ محبت رکھتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا اب تم مؤمن ہو۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ایمان اور کفر کو جانے دو تو محبت خالص خود بھی اپنی ذات میں ایک مذہب ہے قطع نظر اس سے کہ وہ کس کی طرف منسوب ہوتا ہے اور کسے پسند کرتا ہے۔ اِس وقت ساری دنیا میں ناول پڑھے جاتے ہیں اور ناولوں میں بِالعموم یہی عشق و محبت کے ہی قصے ہوتے ہیں مثلاً ہمارے مُلک میں یوسف زلیخا کا قصہ مشہور ہے اور بڑے مزے سے پڑھا جاتا ہے۔ لیلیٰ مجنوں کے قصے بڑے شوق سے سُنے جاتے ہیں حالانکہ مجنوں کون تھا؟ عرب کا ایک بدو تھا اور لیلیٰ عرب کی ایک عورت تھی جو ممکن ہے ہماری نوکرانیوں سے بھی گھٹیا قسم کی ہو لیکن اس لئے کہ مجنوں کو اُس سے عشق ہو گیا ساری دنیا لیلیٰ مجنوں کے قصوں کو بڑے شوق سے پڑھتی ہے حالانکہ فلسفیانہ طور پر اگر غور کیا جائے تو اس میں کوئی عجوبہ نہیں پایا جاتا۔ چنانچہ ایک فلسفی نے عشق کی حقیقت اسی طرح کھینچی ہے کہ یوسف اور زلیخا کا قصہ کیا ہے بس یہی کہ ایک عورت مرد کے لئے لٹو ہو گئی لیکن واقعہ یہ ہے کہ خواہ فلسفیانہ رنگ میں کچھ کہا جائے عشقیہ کتابیں ہر جگہ پسند کی جاتی ہیں اور بڑے شوق کے ساتھ اُن کو خریدا جاتا ہے۔ ہمارے مُلک میں ہی نہیں یورپ اور امریکہ میں بھی اِن کتابوں کی بڑی قدر ہے۔ اِسی طرح بڑے بڑے بادشاہوں کے حالاتِ زندگی دیکھے جائیں تو وہ بھی اِن چیزوں کے دلدادہ نظر آتے ہیں۔ نپولین کے واقعات پڑھ کر دیکھ لو۔ رُوس کے بادشاہ پیٹر کے واقعات پڑھ کر دیکھ لو۔ اِسی طرح بڑے بڑے جرنیلوں کے حالات پڑھ کر دیکھ لو تمہیں یہی معلوم ہوگا کہ وہ اِسی قسم کی کتابوں کو بڑا پسند کرتے تھے بلکہ بعض جرنیل

لڑائی کے لئے جاتے تو اپنے ساتھ ایسی کتابیں رکھ لیتے جو عشق و محبت کے افسانوں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ تو عشق ایسی حسین چیز ہے کہ خواہ ادنیٰ مخلوق سے ہو تب بھی وہ پیارا لگتا ہے۔ پھر اگر خدا سے عشق ہو تو تم سمجھ سکتے ہو کہ وہ کتنا پیارا لگے گا۔

اِسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اِذَا اَحَبَّ اللّٰہُ عَبْدَہٗ لَمْ یَضُرَّہٗ ذَنْبٌ [۵۳] کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے سے محبت کرے (اس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ نہ صرف بندہ خدا سے محبت کرتا ہے بلکہ خدا بھی بندے سے محبت کرنے لگ جاتا ہے) تو کوئی گناہ اُسے ضرر نہیں پہنچاتا۔ اب اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے تھے کہ کوئی گناہ اُس سے سرزد نہیں ہوسکتا اور یہ معنی بھی ہو سکتے تھے کہ گناہ تو اُس سے سرزد ہوتا ہے لیکن وہ اُسے نقصان نہیں پہنچاتا۔ پہلے معنی اِس حدیث کے اِس لئے نہیں ہو سکتے کہ یہاں ذَنْب کا لفظ ہے جس کا صدور ہر انسان کے لئے ممکن ہے۔ پس ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی سے محبت کرنے لگ جائے تو اُس سے ذَنْب سرزد ہی نہیں ہو سکتے۔ ہم اگر معنی کر سکتے ہیں تو یہی کہ ذَنْب تو اس سے صادر ہوسکتا ہے لیکن وہ اسے نقصان نہیں پہنچاتا۔ ذَنْب کا لفظ گناہ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور بشری کمزوری کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ پس یہ مراد نہیں کہ ذَنْب اُس سے صادر ہی نہیں ہوسکتا۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ اگر ذَنْب اُس سے صادر ہو جائے تو اُسے نقصان نہیں پہنچاتا۔ اگر گناہ کے معنی کئے جائیں تو یہ معنی ہوں گے کہ ایسے انسان کو کھلی چھٹی دے دی جاتی ہے کہ جو مرضی ہے کرے۔ خواہ ڈاکہ مارے، خواہ چوری کرے، خواہ بدکاری کرے، خواہ جھوٹ بولے لیکن یہ اسلام کی تعلیم کے خلاف ہے۔ دوسرے معنی اس کے یہ ہو سکتے ہیں کہ اگر وہ گناہ کرے تو اللہ

تعالیٰ ایسے بندہ کو جھٹ توبہ کی توفیق دے دیتا ہے اور اس طرح گناہ اُسے نقصان نہیں پہنچا سکتا اور یہی اس کے حقیقی معنی ہیں۔ چنانچہ اس حدیث کے اگلے ٹکڑہ میں اس کی وضاحت آ جاتی ہے چنانچہ مذکورہ بالا عبارت کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لاَ ذَنْبَ لَهٗ [۵۴] یعنی اُسے گناہ سے نقصان اس لئے نہیں ہوتا کہ وہ ضرور توبہ کر لیتا ہے اور جو گناہ سے توبہ کر لے وہ ایسا ہی ہے کہ جیسے اُس نے گناہ کیا ہی نہیں۔ غرض اس حدیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ مومن کی حالت ایسی ہوتی ہے کہ جب خدا اُس سے پیار کرنے لگ جائے تو اُس کا کوئی گناہ اُسے نقصان نہیں پہنچاتا۔ یہ معنی نہیں کہ وہ کوئی ادنیٰ غلطی بھی نہیں کرتا۔ یہ معنی بھی نہیں کہ وہ کوئی بڑی غلطی نہیں کرتا بلکہ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس کو ایسی خشیت کے مقام پر لے جاتا ہے کہ اِدھر وہ غلطی کرتا ہے اور اُدھر اللہ تعالیٰ اُسے توبہ کی توفیق عطا فرما دیتا ہے اور وہ گناہ اُسے معاف ہو جاتا ہے۔ یہی آدم کے قصہ کی حقیقت ہے کہ وہ بھول گیا تھا۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ہی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ نَسِیَ [۵۵] آدم بھول گیا اور اُس سے غلطی سرزد ہوگئی۔ اس کے بعد وہ گھبرایا تو ہم نے کہا گھبراتے کیوں ہو دعا کرو ہم تمہیں معاف کر دیں گے۔ چنانچہ آپ ہی اُسے دعا سکھلائی اور پھر اُسی دعا کے کرنے پر اُنہیں معاف کر دیا۔ چنانچہ فرماتا ہے فَتَلَقّٰٓی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ [۵۶] اس پر آدم نے اپنے ربّ سے کچھ دعائیں سیکھیں فَتَابَ عَلَيْهِ [۵۷] جن کے مانگنے پر اللہ تعالیٰ نے اُسے معاف کر دیا۔ غرض محبت کا تعلق بندہ اور اللہ تعالیٰ میں دونوں طرف سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی بندے سے محبت کرتا ہے اور بندہ بھی اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے۔

اِس سے اُوپر خُلّة کا مقام ہے۔ خُلّة کا لفظ خلل سے نکلا ہے اور یہ لفظ ہمارے مُلک میں عام طور پر استعمال ہوتا ہے۔ کہتے ہیں ہمارے دماغ میں خلل ہے۔ ہمارے مُلک میں خلل ہے۔ ہماری جماعت میں خلل ہے لیکن لوگ سمجھتے نہیں کہ اس کے معنی کیا ہیں۔ لغت کے لحاظ سے اُس کے معنی سوراخ اور فاصلہ کے ہوتے ہیں اور یہ ضد کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ بعض لفظ عربی زبان میں ایسے ہیں جو ایک معنی ہی نہیں دیتے بلکہ اُس کے اُلٹ معنی بھی دے دیتے ہیں یعنی اُسی میں شر کے معنی شامل ہوں گے اور اُسی میں خیر کے معنی بھی شامل ہوں گے۔ اسی میں فاصلہ کے معنی شامل ہوں گے اور اسی میں قرب کے معنی شامل ہوں گے۔ اِسی قسم کا یہ لفظ بھی ہے جس کے معنی سوراخ اور فاصلہ کے بھی ہیں اور ایسی محبت اور دوستی کے بھی ہیں جس میں کوئی خلل نہ ہو۔ گویا خُلّة کے معنی اُس محبت کے ہیں جو تمام اختلافات کو دور کر دے اور جذبات اور خیالات میں یکجہتی پیدا کر دے۔ یہ معنی تو اقرب الموارد والے نے کئے ہیں لیکن مفردات والا کہتا ہے کہ خلل کے معنی شگاف کے ہیں اور جسم کے شگاف اُس کے مسام اور سوراخ ہیں جن سے پسینہ نکلتا اور زہریلے مواد خارج ہوتے رہتے ہیں اور مساموں کے راستہ ہی باہر کی کئی چیزیں جسم میں داخل ہوتی رہتی ہیں۔ پس خُلّة کے معنی یہ ہیں کہ ایسی محبت جو خلل کے اندر گھس جائے یعنی خالی دل ہی میں نہ گھسے بلکہ جسم کے سُوراخ سُوراخ میں داخل ہو جائے اور پھیل جائے۔ محبت اُس کو کہتے ہیں جو صرف ایک مقام یعنی دل میں داخل ہو جائے لیکن خُلّة اُس دوستی کو کہتے ہیں جو جسم کے تمام مساموں میں داخل ہو جائے اور کوئی حصۂ بدن بھی اُس سے خالی نہ ہو۔ نہ ہاتھ اُس سے خالی ہوں نہ پاؤں اُس سے خالی ہوں نہ کان

اُس سے خالی ہوں نہ آنکھ اُس سے خالی ہو نہ دل اُس سے خالی ہو نہ دماغ اُس سے خالی ہو گویا وہ انسانی جسم اور روح اور دل اور دماغ پر اتنی حاوی ہو جائے کہ ہاتھ ہوں تو وہ محبوب کا وجود بنے ہوئے ہوں۔ پاؤں ہوں تو وہ محبوب کا وجود بنے ہوئے ہوں اور غیریت کا سوال ہی باقی نہ رہے۔ حُبّ باہر سے حکم لاتی ہے لیکن خُلّۃ باہر سے نہیں بلکہ نیچرل اور طبعی طور پر کام کرتی ہے۔ یہ معنی جو مفردات والوں نے کئے ہیں زیادہ اچھے اور زیادہ صحیح ہیں۔

اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا [۵۸] ابراہیم کو اللہ تعالیٰ نے خلیل بنایا۔ اِسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپؐ کی وفات کی خبر آئی تو آپؐ نے صحابہؓ کو جمع کیا اور اُن میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ خدا کا ایک بندہ تھا جسے اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اے میرے بندے! اگر تو چاہے تو میں تجھے اپنے پاس بُلالوں اور اگر تو دنیا میں اَور رہنا چاہے تو میں تیری عمر کو اَور لمبا کر دوں۔ اُس بندے نے کہا اے میرے خدا! میں دنیا میں نہیں رہنا چاہتا تو مجھے اپنے پاس ہی بُلا لے۔ صحابہؓ نے یہ بات سنی تو اُنہوں نے سمجھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مثال دی ہے اور وہ دل میں خوش ہوئے کہ آج ہمیں ایک بڑا اچھا نکتہ ملا ہے۔ مگر حضرت ابوبکرؓ یہ سنتے ہی رونے لگ گئے اور اتنے روئے کہ اُن کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ تب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے لوگو! ابوبکر مجھے اتنا پیارا ہے کہ اگر خدا کے سِوا میں کسی اور کو خلیل بنا سکتا تو ابوبکر کو بنا لیتا۔ [۵۹] معلوم ہوا کہ اسلام میں کسی انسان سے محبت کرنا تو جائز ہے لیکن خُلّۃ صرف خدا تعالیٰ کیلئے جائز ہے گو استعارہ کے طور

پر انسانوں کیلئے بھی کبھی کبھی بول لیتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بہت بعد میں اسلام لائے تھے مگر اُنہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سننے کا بہت شوق تھا اور اسی وجہ سے اُنہوں نے ہزاروں حدیثیں بیان کی ہیں مگر جیسا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے لکھا ہے اُن کی درایت ایسی اعلیٰ نہیں تھی وہ ہمیشہ نئے آنے والوں پر جب اپنے فخر کا اظہار کیا کرتے تو کہا کرتے تھے کہ خلیلی نے یہ فرمایا ہے۔ خلیلی نے یہ فرمایا ہے اور مراد یہ ہوا کرتی تھی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا ہے۔ گویا اپنا تعلق جتانے کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بعض دفعہ خلیل کا لفظ استعمال کر لیا کرتے تھے۔ حضرت ابن عباسؓ ایک دفعہ کہیں بیٹھے ہوئے تھے کہ اُنہوں نے اِسی طرح کہنا شروع کیا کہ خلیلی نے یوں کہا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے سنا تو اُنہیں بُرا معلوم ہوا اور اُنہوں نے ڈانٹا کہ تم یہ کیا کہہ رہے ہو کیا ہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہیں تھے اور کیا ہم دیکھا نہیں کرتے تھے کہ تمہارا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کتنا تعلق تھا؟ معلوم ہوتا ہے جوش میں حضرت ابو ہریرہؓ اس طرح کہہ لیتے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ صرف خدا اور بندے کے انتہائی تعلق پر ہی خُلّة کا لفظ بولا جا سکتا ہے۔ اگر اس لفظ کو کسی اور مفہوم یا مقام پر استعمال کیا جائے گا تو وہ بہر حال استعارہ کہلائے گا۔ پس خُلّة کا لفظ مقاماتِ محبت میں سب سے بلند ہے چونکہ عام لفظ محبت ہے ہم اُسی کو آسانی کے ساتھ استعمال کر لیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ محبت کے مختلف درجے ہیں۔ (۱) رغبت (۲) اُنس (۳) وُدْ (۴) محبت (۵) خُلّة اور یہ پانچوں درجے وہ ہیں جن کا قرآن کریم سے ثبوت ملتا ہے۔

محبت کے اظہار کے لئے الفاظ تو بعض اَور بھی ہیں مگر وہ لمبے فقروں میں استعمال ہوئے ہیں اس لئے میں نے اُن کو چھوڑ دیا ہے اور دو لفظ ایسے ہیں جن کو میں نے لیا ہی نہیں یعنی شوق اور عشق۔ ان پانچ الفاظ میں دو تو صرف بندوں کی محبت کے لئے استعمال ہوتے ہیں اور تین ایسے ہیں جو بندے اور خدا دونوں میں شریک ہیں یعنی بندے کے خدا سے تعلق پر بھی استعمال ہوتے ہیں اور خدا کے بندے سے تعلق پر بھی استعمال ہوتے ہیں۔

یہ جو میں نے کہا تھا کہ عشق کے معنی ہلاکت کے ہیں اور اسی لئے اللہ تعالیٰ کی محبت کے متعلق قرآن کریم یا احادیث میں یہ لفظ استعمال نہیں کیا گیا اس کا حدیثوں سے بھی ثبوت ملتا ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مَنْ عَشِقَ فَعَفَّ ثُمَّ مَاتَ مَاتَ شَهِيْدًا [۶۰] یعنی اگر کسی شخص کو عشق ہو جائے اور پھر وہ اپنا تقویٰ قائم رکھے اور مر جائے تو وہ شہید ہوتا ہے۔ اِس سے پتہ لگا کہ عشق کا لفظ صرف شہوت یا ایسی مفرطِ محبت کے لئے استعمال ہوتا ہے جو صحت کو برباد کر دیتی اور دماغ کو ناکارہ بنا دیتی ہے۔ اگر خدا تعالیٰ کی محبت کو عشق کہا جا سکتا ہے تو پھر اِس سے روکنے کے کیا معنی تھے۔ ایسی ہی روایت ابن عساکرؔ نے بھی ابن عباسؓ سے کی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ محبت جسمانی جو انتہاء کو پہنچ جائے اور جب صبر بظاہر ناممکن ہو جائے تو اُس کے مفہوم میں عشق کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور چونکہ یہ بُرے معنوں میں استعمال ہونے لگا ہے یعنی شہوت یا ایسی مفرط محبت کے معنوں میں جو دماغ کو خراب کر دیتی ہے اور اسلام ایسے کسی فعل کو پسند نہیں کرتا خواہ خدا تعالیٰ ہی کے متعلق ہو اس لئے گو عشق بھی محبت کے معنی رکھتا ہے مگر یہ

لفظ اللہ تعالیٰ کے لئے کسی صحیح حدیث یا قرآن میں نہیں آیا۔ اللہ تعالیٰ اور مؤمنوں کے متعلق قرآن یا حدیث میں صرف (۱) رغبت (۲) اُنس (۳) وُدّ (۴) محبت اور (۵) خُلّة کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ پہلے دو صرف ایسی محبت کی نسبت استعمال ہوتے ہیں جو انسان کو اللہ تعالیٰ سے ہوتی ہے اور دوسرے تین اُس محبت کے متعلق استعمال ہوئے ہیں جو دونوں طرف سے ممکن ہے اور ہوتی ہے۔ رغبت اور اُنس کے لفظ اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال نہیں ہوے کہ اوّل یہ ادنیٰ درجہ کی محبتیں ہیں اور اللہ تعالیٰ کی محبت ادنیٰ نہیں ہوسکتی۔ دوسرے اس لئے کہ دونوں میں دوری سے نزدیکی اور وحشت سے قرب کے معنی پائے جاتے ہیں اور یہ باتیں انسان میں تو ہوتی ہیں کہ وہ پہلے دور ہوتا ہے اور پھر نزدیک ہونے کی خواہش کرتا ہے یا پہلے وحشت رکھتا ہے اور پھر قرب کا کوئی موقع مل جائے تو اُسے سکون محسوس ہوتا ہے اور وہ بار بار اس کی خواہش کرتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ ایسا صرف انسان سے ممکن ہے اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان نہیں کیونکہ وہ انسان کی ہر حالت سے ہر وقت واقف ہے اور اُس کی طرف جانے کی خواہش یا اُس سے کسی وقت ملاقات کے نتیجہ میں اُس سے سکون کا حصول اُس کی شان اور درجہ کے منافی ہے۔ پس بندے کی محبت، رغبت اور اُنس سے ترقی کرنا شروع کرتی ہے اور وُدّ کے مقام پر خدا تعالیٰ کی محبت میں مدغم ہوجاتی ہے اور پھر دونوں محبتیں مل کر خُلّة کے مقام پر ختم ہوجاتی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر مقام پر بندے سے اونچا ہوتا ہے۔ ایک وقت ایسا ہوتا ہے کہ انسان راغب ہوتا ہے مگر اللہ تعالیٰ ودُود۔ انسان انیس ہوتا ہے مگر اللہ تعالیٰ ودُود۔ پھر وہ وقت آتا ہے کہ یہ وادِدْ ہوجاتا ہے مگر اللہ تعالیٰ اس کے لئے ودُود ہوجاتا ہے

جو وادِوْ سے زیادہ شدید ہے۔ اِس کے بعد یہ مُحِبّ ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ بھی اس سے محبت کرنے لگ جاتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کی محبت پھر بھی اِس کی محبت پر فائق رہتی ہے۔ بظاہر چونکہ لفظ ایک ہے اس لئے بادی النظر میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ جس طرح بندہ محبت کرتا ہے اِسی طرح شاید خدا تعالیٰ بھی اپنے بندے سے محبت کرتا ہوگا۔ حالانکہ یہ درست نہیں محبت کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں جیسے ماں کی محبت اور قسم کی ہوتی ہے، باپ کی محبت اور قسم کی ہوتی ہے، بیوی بچوں کی محبت اور قسم کی ہوتی ہے۔ پس یہ غلط ہے کہ بندہ کی محبت اور خدا تعالیٰ کی محبت ایک جیسی ہے۔ بندہ جب مقاماتِ محبت میں ترقی کرتے کرتے مُحبّ ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کے لئے اَحَبُّ مِنَ الْاُمِّ ہو جاتا ہے یعنی ماں سے بھی زیادہ اُس سے محبت کرنے لگ جاتا ہے اور اس کا ثبوت ہمیں ایک حدیث سے ملتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ قَدِمَ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِسَبْیٍ فَاِذَا امْرَأَۃٌ مِنَ السَّبْیِ تَبْتَغِیْ اِذَا وَجَدَتْ صَبِیًّا فِی السَّبْیِ اَخَذَتْہُ فَاَلْصَقَتْہُ بِبَطْنِھَا وَاَرْضَعَتْہُ فَقَالَ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَتَرَوْنَ ھٰذِہِ الْمَرْأَۃَ طَارِحَۃً وَلَدَھَا فِی النَّارِ قُلْنَا لَاوَاللّٰہِ وَھِیَ تَقْدِرُ عَلٰی اَلَّاتَطْرَحَہٗ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَللّٰہُ اَرْحَمُ بِعِبَادِہٖ مِنْ ھٰذِہٖ بِوَلَدِھَا [۶۱] یعنی ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ قیدی لائے گئے جن میں ایک عورت بھی تھی جب وہ قیدیوں میں کسی بچہ کو دیکھتی تو اُسے اُٹھاتی اپنے سینہ سے لگاتی اور پھر اُسے دودھ پلاتی۔ اِس روایت میں تو ذکر نہیں آتا مگر دوسری روایتوں میں آتا ہے کہ وہ اسی طرح کرتی رہی یہاں تک کہ اُس کا اپنا بچہ اُسے مل گیا اور وہ اُسے گود میں لے کر اطمینان کے ساتھ بیٹھ گئی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ

وسلم نے اُس عورت کو دیکھا اور پھر صحابہؓ سے فرمایا کہ تمہارا کیا خیال ہے اگر کوئی شخص اس سے کہے کہ اپنے بچہ کو آگ میں پھینک دے تو کیا یہ اُسے پھینک دے گی؟ صحابہؓ نے عرض کیا خدا کی قسم! اگر اس کا بس چلے تو وہ کبھی اپنے بچہ کو آگ میں نہیں پھینکے گی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم نے جو اس عورت کی محبت کا نظارہ دیکھا ہے اللہ تعالیٰ اِس سے بھی زیادہ اپنے بندوں سے محبت رکھتا ہے۔ ماں سے تو دس آدمی مل کر اُس کا بچہ چھین سکتے ہیں مگر وہ کون ماں کا بچہ ہے جو خدا کی گود سے کسی کو چھین سکے۔ اِس لئے خدا کی محبت زیادہ شاندار اور زیادہ پائیدار اور زیادہ اثر رکھنے والی ہے۔

اِس حدیث میں رحم کا لفظ محبت کے معنوں میں استعمال ہوا ہے کیونکہ ماں بچہ پر رحم نہیں کرتی اُس سے محبت کرتی ہے۔ پس مثال نے اِس کے معنی متعین کر دیئے ہیں۔

پھر اس سے اوپر ترقی کر کے بندہ خُلّة کے مقام پر پہنچ جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اور انسان دونوں خلیل کہلاتے ہیں۔ لیکن جس طرح اللہ تعالیٰ محبت میں زیادہ ہوتا ہے اِسی طرح خُلّة میں بھی زیادہ ہوتا ہے۔ لفظ ایک ہے مگر بندے کی خُلّة اور خدا تعالیٰ کی خُلّة میں بڑا بھاری فرق ہے کیونکہ گو جذباتِ محبت ہر وقت زندہ رہتے ہیں لیکن سونے اور جاگنے کی حالت میں اُن میں فرق ہو جاتا ہے۔ سوتے وقت جذبات زندہ تو ہوتے ہیں مگر وہ دَب جاتے ہیں اور اُن پر ایک طرح کا پردہ پڑ جاتا ہے پس چونکہ انسان پر سِنَةٌ اور نَوْمٌ آتے ہیں اور اُس وقت خُلّة تو ہوتی ہے مگر اُونگھ اور نیند کی وجہ سے اُس طرح کی نہیں ہوتی جس طرح جاگتے

وقت کی ہوتی ہے۔ اِس لئے خدا اور بندے کی خُلّة میں بڑا بھاری فرق ہے۔ خدا تعالیٰ لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ [۶۲] کا مصداق ہے۔ پس یہ جاگتا ہے تب بھی اللہ تعالیٰ اِس سے اُسی طرح محبت کرتا ہے اور یہ سوتا ہے تب بھی اُس کی خُلّة اُسی طرح جاری رہتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جس کی طرف حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی ایک تحریر میں بھی اشارہ کیا ہے جو میں تشحیذ الاذہان اور بدر میں شائع کروا چکا ہوں۔ اُس میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام اللہ تعالیٰ کو مخاطب کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

''دنیا کہتی ہے تُو کافر ہے مگر کیا تجھ سے پیارا مجھے کوئی اور مل سکتا ہے اگر ہوتو اُس کی خاطر تجھے چھوڑ دوں۔ لیکن میں تو دیکھتا ہوں کہ جب لوگ دنیا سے غافل ہو جاتے ہیں، جب میرے دوستوں اور دشمنوں کو علم تک نہیں ہوتا کہ میں کس حال میں ہوں اُس وقت تو مجھے جگاتا ہے اور محبت اور پیار سے فرماتا ہے کہ غم نہ کھا میں تیرے ساتھ ہوں تو پھر اے میرے مولیٰ! یہ کس طرح ممکن ہے کہ اس احسان کے ہوتے ہوئے پھر میں تجھے چھوڑ دوں۔ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں''۔ [۶۳]

تو دیکھو سوتے وقت جب انسان کا جسم اور روح بھی اُسے ایک طرح چھوڑ جاتے ہیں اُس وقت بھی خدا تعالیٰ اپنے بندے کو نہیں چھوڑتا۔ اِس لئے خدا تعالیٰ کا مقامِ خُلّة انسان کے مقامِ خُلّة سے بہت بالا ہے۔ نام دونوں محبتوں کا ایک ہے مگر دونوں کی کیفیت میں بہت فرق ہے۔

پس محبت کے تمام مقاموں میں سے جو ادنیٰ ہیں وہ صرف انسان سے مخصوص

ہیں۔خدا تعالیٰ اُن کے مقابل پر اُن سے اعلیٰ مقام کی محبت دکھاتا ہے اور جو اعلیٰ مقام ہیں اور بندہ اور خدا میں مشترک ہیں اُن میں بھی اللہ تعالیٰ ہمیشہ بندے سے آگے رہتا ہے۔ اِسی نکتہ کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک حدیث میں یوں بیان فرماتے ہیں:۔

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّہٗ قَالَ قَالَ اللّٰہُ عَزَّ وَجَلَّ اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ وَاَنَا مَعَہٗ حَیْثُ یَذْکُرُنِیْ۔ وَاللّٰہِ لِلّٰہِ اَفْرَحُ بِتَوْبَۃِ عَبْدِہٖ مِنْ اَحَدِکُمْ یَجِدُ ضَالَّتَہٗ بِالْفَلَاۃِ وَمَنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ شِبْرًا تَقَرَّبْتُ اِلَیْہِ ذِرَاعًا وَمَنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ ذِرَاعًا تَقَرَّبْتُ اِلَیْہِ بَاعًا وَاِذَا اَقْبَلَ اِلَیَّ یَمْشِیْ اَقْبَلْتُ اِلَیْہِ اُھَرْوِلُ [۶۴] حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ خدا نے مجھے الہام سے فرمایا ہے کہ میں اپنے بندے کے یقین کے مطابق اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہوں اور جب کبھی بندہ مجھے یاد کرتا ہے میں فوراً اُس کے پاس پہنچ جاتا ہوں۔ پھر اس کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے خدا کی قسم ہے! کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی توبہ پر اس شخص سے زیادہ خوشی محسوس کرتا ہے جس نے سخت جنگل میں اپنی اونٹنی کھوئی اور پھر وہ اُسے مل گئی۔ اس کے بعد فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے بتایا ہے کہ جو شخص میرے پاس ایک بالشت بھر چل کر آتا ہے میں اُس کے پاس ایک ہاتھ چل کر آتا ہوں۔ (ذراع اُنگلیوں سے لے کر کُہنی تک کے حصہ کو کہتے ہیں) اور جو شخص ایک ہاتھ چل کر میرے پاس آتا ہے میں اُس کی طرف ایک باع (یعنی دونوں بازوؤں کے پھیلاؤ کے برابر) چل کر جاتا ہوں۔ اور جب بندہ میرے پاس چلتے ہوئے آتا ہے تو اَقْبَلْتُ اِلَیْہِ اُھَرْوِلُ میں اُس کی طرف دَوڑنا شروع کر دیتا ہوں۔ غرض ہر

مقام پر اللہ تعالیٰ بندے سے اونچے مقام پر رہتا ہے بندہ ایک بالشت چلتا ہے تو خدا تعالیٰ ایک ہاتھ چلتا ہے۔ بندہ ایک ہاتھ چلتا ہے تو خدا تعالیٰ ایک باع چل کر آتا ہے۔ بندہ اس کی طرف چل پڑتا ہے تو خدا تعالیٰ اپنی محبت کے جوش میں اُس کی طرف دوڑ پڑتا ہے۔

اب میں یہ بتاتا ہوں کہ جہاں اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ بندہ جس جس حد تک کام کرے اللہ تعالیٰ اُس سے زیادہ کام کرتا ہے وہاں اُس نے محبت کے کچھ قانون بھی بنائے ہیں جب کوئی شخص محبت الٰہی کے میدان میں قدم رکھنا چاہے تو اُسے اِن قانونوں کو مدنظر رکھنا چاہیے چنانچہ پہلا قانون یہ ہے کہ جب بندہ رغبت، اُنس اور وُدّ کے مقام سے ترقی کر کے حُبّ کے مقام پر پہنچ جاتا ہے تو اس مقام کے لئے یہ شرط ہے کہ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَأَمْوَالُ نِاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِّنَ اللهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَأْتِيَ اللهُ بِأَمْرِهٖ وَاللهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (سورۃ التوبۃ: ۲۴) یعنی رغبت کے مقام تک اگر انسان میں کمزوری ہو اور بیوی بچوں کی محبت اُس کے دل پر غالب ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی پرواہ نہیں کرتا۔ سمجھتا ہے کہ یہ کمزور ہے۔ ایسا مضبوط نہیں کہ اس جذبہ پر غالب آ سکے۔ جب انسان اُنس کے مقام پر آتا ہے تو وہ زیادہ قربانیاں چاہتا ہے مگر یہ نہیں چاہتا کہ وہ سب کچھ بھول جائے۔ جب اِنسان وُدّ کے مقام پر آتا ہے تو وہ اپنے بندہ سے اُنس کے مقام سے بھی زیادہ قربانیوں کا تقاضا کرتا ہے مگر پھر بھی اُس کی کمزوریوں کا خیال رکھتا ہے لیکن جب وہ حُبّ کے مقام پر پہنچ

جائے تو چونکہ اب ترقی کرتے کرتے محبت کے بہت سے اسرار اُس پر کھل چکے ہوتے ہیں اِس لئے اللہ تعالیٰ بھی چاہتا ہے کہ اب بندہ یہ فیصلہ کر لے کہ میں نے خدا تعالیٰ کی محبت کے مقابلہ میں کسی اَور کو منہ نہیں لگانا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ قانون اللہ تعالیٰ نے حُبّ کے متعلق رکھا ہے رغبت کے متعلق نہیں رکھا۔ اُنس کے متعلق نہیں رکھا۔ وُدّ کے متعلق نہیں رکھا۔ رغبت جس میں کچھ خدا کی محبت ہو اور کچھ دنیا کی محبت انسان کو خدا کا مقرب بنا سکتی ہے۔ اُنس جس میں خدا کی بھی محبت ہو اور دنیا کی بھی محبت ہو اللہ تعالیٰ کے قرب میں انسان کو کچھ نہ کچھ بڑھا دیتا ہے۔ اگر رغبت یا اُنس کے مقام پر انسان سے کچھ غلطی ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کہے گا کہ جانے دو میرا یہ بندہ ابھی پورے طور پر ہوش میں نہیں آیا اس کی غلطیاں نظر انداز کرنے کے قابل ہیں پھر وہ وُدّ کے مقام پر بھی پہنچ جائے گا تو اللہ تعالیٰ اُس کی غلطیوں کی کچھ زیادہ پرواہ نہیں کرے گا کیونکہ نہ وہ خدا میں فنا ہو گیا ہوگا اور نہ خدا اُس کے دل میں جا بسا ہوگا۔ اُس کی مثال ایسی ہوگی جیسے کوئی نابالغ بچہ لڑائی میں شامل ہوا اور اس نے کمزوری دکھائی اور وہ میدان سے بھاگ گیا لیکن جب حُبّ کے مقام پر انسان پہنچ جائے تو اُس وقت وہ اپنے باپ کو یا اپنے بیٹے کو یا اپنے بھائی کو یا اپنی بیوی کو یا اپنے قبیلہ کو یا اپنے خاندان کو یا اپنے مال کو یا اپنی شہرت کو یا اپنے علم کو یا اپنی نیک نامی کو یا اپنے مکانوں اور جائدادوں کو خدا تعالیٰ پر ترجیح دے تو وہ خدا تعالیٰ کے دربار سے دھتکار دیا جائے گا اور اُسے کہا جائے گا کہ تم نے ہمارے مقامِ محبت کی ہتک کی ہے۔ پس بے شک یہ مقام اعلیٰ ہے مگر اس مقام کی ذمہ داریاں بھی بڑی ہیں۔ جو پہلی رعائتیں تھیں وہ اس مقام پر آ کر ختم ہو جاتی ہیں۔ مقامِ رغبت تک وہ مزے

میں تھا اور اِدھر اُدھر جا سکتا تھا۔ اُنس کے مقام تک بھی اگر اُس سے غلطی ہو جاتی اور فرشتے کہتے کہ ہم اسے سزا دیں تو اللہ تعالیٰ کہتا کہ سزا کیسی؟ ابھی اِس نے ہوش تھوڑی سنبھالی ہے۔ پھر وُدّ کا مقام آیا تو اس مقام میں بھی یہ خطرے سے باہر تھا کیونکہ گو وہ بلوغت کے قریب پہنچ چکا تھا لیکن ابھی بالغ کے احکام اُس پر جاری نہیں ہو سکتے تھے لیکن جب وہ حُبّ کے مقام پر پہنچا تو بالغ ہو گیا اور اس پر تمام احکام جاری ہونے لگ گئے۔ جب تک یہ بالغ نہیں ہوا تھا اس کی گرفت کا کوئی سوال ہی نہیں تھا جیسے لڑائی ہو رہی ہو تو کوئی شخص بچوں کو نہیں پکڑتا کہ تم لڑائی پر کیوں نہیں جاتے بلکہ اگر کوئی نابالغ بچوں کو پیش بھی کرے تو ذمہ دار افسر ہنس پڑتے ہیں کہ کس کو پیش کیا جا رہا ہے چنانچہ تاریخوں سے ثابت ہے کہ بعض دفعہ بارہ بارہ برس کے لڑکے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے اور کہتے کہ یَا رَسُوْلَ اللّٰہ ہمیں بھی جہاد میں شامل ہونے کی اجازت دیجئے۔ مگر آپ فرماتے کہ جاؤ ابھی تم پر جہاد فرض نہیں۔ تو رغبت کے مقام پر اور اُنس کے مقام پر اور وُدّ کے مقام پر گناہوں سے معافی زیادہ ملتی ہے۔ مگر جب انسان حُبّ کے مقام پر پہنچ جائے تو گناہوں کی معافی کم ہو جاتی ہے۔

اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ خدا تعالیٰ کی رحمت ہمیشہ کے لئے جاری ہے اور توبہ کے ساتھ خواہ کیسے ہی گناہ ہوں معاف ہو جاتے ہیں لیکن بہرحال پہلے مقام وہ تھے جن میں معافی کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ جیسے چھوٹا بچہ دودھ پیتے پیتے بعض دفعہ اپنی ماں کا پستان کاٹ لیتا ہے مگر ماں اُسے کبھی نہیں کہتی کہ مجھ سے معافی مانگو۔ وہ سمجھتی ہے کہ یہ بچہ ہے اور اس سے نادانی میں یہ حرکت ہو گئی ہے۔ اِسی طرح رغبت اور

اُنس اور وُدّ کے مقام پر معافی کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ وہ چاہے مانگے یا نہ مانگے۔ اللہ تعالیٰ اُسے بچے کی طرح سمجھتا ہے گویا نیکی تو اُس میں موجود ہوتی ہے لیکن توبہ کا مقام اُسے حاصل نہیں ہوتا۔ اِس کے بعد جب وہ حُبّ کے مقام پر پہنچتا ہے اور پھر کوئی غلطی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کہتا ہے اب یہ معافی مانگے گا تو ہم معاف کریں گے یوں ہم اسے معاف نہیں کر سکتے جب یہ توازن قائم نہیں رہتا تو انسان ہلاک ہو جاتا ہے اور وہ رغبت اور اُنس کے مقام پر بعض دفعہ محبت الٰہی کا دعویٰ کرنے لگ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم محبوبِ خدا ہو گئے ہیں حالانکہ جب تک وہ ایک بچہ کی حیثیت رکھتا ہے اُس کا فرض ہے کہ وہ یہ کہے کہ میں ان راہوں سے زیادہ واقف نہیں میری حیثیت ایک بچہ کی سی ہے اور جب وہ بالغ ہو جائے تو پھر بالغ کی ذمہ داریاں سمجھے اور خدا تعالیٰ کی محبت کے مقابلہ میں کسی چیز کو ترجیح نہ دے۔

(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ جب انسان محبت کے مقام پر پہنچے تو پھر خدا تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دے۔ جو شخص اس مقام سے گرتا ہے وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے سخت سزا پاتا ہے۔ رغبت کے مقام پر اگر اُس سے ذہول ہو جائے تو زیادہ حرج نہیں۔ اُنس کے مقام پر اگر اُس سے ذہول ہو جائے تو زیادہ حرج نہیں۔ وُدّ کے مقام پر اگر اس سے ذہول ہو جائے تو زیادہ حرج نہیں لیکن جب محبت کے مقام پر پہنچ جائے تو پھر اس مقام کو مضبوطی سے پکڑ لے اور اللہ تعالیٰ کو ایک آن کے لئے بھی اپنی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دے۔ قرآن کریم میں آتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس اُن کے دشمن آئے اور اُنہوں نے کہا کہ کیا ستاروں کی پرستش کرنا جائز ہے؟ آپ نے فرمایا ذرا ٹھہرو۔ جب ستارے

آنکھوں سے اوجھل ہو گئے تو آپ نے فرمایا کہ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ [۶۵] وہ چیز جو آنکھوں سے اوجھل ہو جائے میں اُس سے محبت نہیں کر سکتا۔ اگر یہ خدا ہیں تو پھر اوجھل کیوں ہو گئے۔ محبت تو اُس سے ہو سکتی ہے جو آنکھوں سے اوجھل نہ ہو۔ پس کامل محبت تقاضا کرتی ہے کہ انسان اپنے محبوب کو اپنی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دے۔ کیا تم نے کبھی کوئی ماں ایسی دیکھی ہے جسے یہ یاد کرانے کی ضرورت ہو کہ اپنے بچہ سے محبت کر۔ بچہ کہیں بیٹھا ہو اس کے دل میں محبت کی چنگاری سُلگ رہی ہوتی ہے اور بعض دفعہ بیٹھے بیٹھے اُس کے منہ سے آہ نکل جاتی ہے۔ بیوی خاوند آپس میں محبت کرتے ہیں تو خواہ خاوند کتنی دور چلا جائے جب بھی اُس کا ذہن خالی ہوگا وہ اپنی بیوی کو ضرور یاد کرے گا۔ بعض دفعہ ایک سپاہی لڑائی میں شامل ہوتا ہے۔ میدانِ جنگ میں کام کر رہا ہوتا ہے۔ بندوقیں چل رہی ہوتی ہیں اور موت کا بازار گرم ہوتا ہے لیکن اُس وقت بھی اگر اُسے اپنی بیوی یاد آ جائے تو اُس کی آہ نکل جاتی ہے۔ بیوی بعض دفعہ پھلکے پکا رہی ہوتی ہے کہ اپنے میاں اُسے یاد آ جاتے ہیں اور پھلکے پکاتے پکاتے اُس کی آہ نکل جاتی ہے۔ تو فرماتا ہے لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ اگر تمہارا خدا تعالیٰ سے تعلق ہو اور کبھی اُس کی محبت تمہارے دل میں آ جاتی ہو اور کبھی نہ آتی ہو تو تم مت کہو کہ ہمیں خدا تعالیٰ سے محبت ہے تم کہو کہ ہمیں اُس سے رغبت ہے، تم کہو کہ ہمیں اُس سے اُنس ہے تم کہو کہ ہمیں اُس سے وُدّ ہے مگر یہ مت کہو کہ ہمیں اُس سے محبت ہے کیونکہ محبت اُسی وقت ہو سکتی ہے جب محبوب کی یاد دل سے جدا نہ ہو۔ خیال تو دوسری طرف جا سکتا ہے جیسے کھیل کے وقت کھیل کا ہی خیال رہے گا لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ محبت کا جذبہ بالکل جاتا رہے۔ بلکہ جب بھی وہ اللہ تعالیٰ

کا خیال کرے گا اُسی وقت اُس کی محبت بھی آ جائے گی ۔ جو شخص کبھی محبت کرتا ہے اور کبھی نہیں کرتا اُس کی محبت کبھی قبول نہیں ہوتی یا یوں کہو کہ وہ محبت ہی نہیں ہوتی لیکن توبہ واستغفار قبول ہو جاتا ہے حالانکہ توبہ واستغفار بھی انسان کبھی کرتا ہے اور کبھی نہیں کرتا۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ محبت جذبات کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور توبہ واستغفار دماغ کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ محبت ہمیشہ یکساں چلتی چلی جائے گی چاہے انسان خوشی میں ہو یا رنج میں ۔ یہ تو ہوسکتا ہے کہ محبت کی لہر کبھی اونچی چلی جائے اور کبھی نیچے آ جائے لیکن یہ کبھی نہیں ہوگا کہ وہ کبھی غائب ہی ہو جائے ۔ اِس کے مقابلہ میں توبہ واستغفار میں یہ ہوگا کہ کبھی ہم توبہ واستغفار کررہے ہوں گے اور کبھی نہیں کررہے ہوں گے ۔ پس الٰہی محبت وہی ہوسکتی ہے جو سب سے زیادہ ہو اور اُس میں دوام پایا جائے ۔

قرآن کریم کی رُو سے محبت کی دو اقسام ثابت ہوتی ہیں۔ اوّل محبت کسبی جو انسان کسب سے حاصل کرتا ہے یعنی پہلے وہ رغبت کرتا ہے پھر اُنس کرتا ہے پھر وُدّ کرتا ہے اور پھر محبت کرتا ہے۔ یہ محبت بندے کی طرف سے آتی ہے گویا کسبی چیز وہ ہے جو بندہ کرتا ہے اور وہبی وہ ہے جو خدا کی طرف سے آتی ہے چاہے وہ محبت سے ہی شروع ہو جائے۔ بہرحال کسبی محبت میں کوشش بندے کو کرنی پڑتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اِس محبت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے **إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ط وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ** [۶۶] یعنی اگر تمہارے دلوں میں خدا تعالیٰ کی محبت پائی جاتی ہے تو تمہیں یاد رکھنا چاہیے کہ مقابل میں بھی محبت کا پیدا ہونا ایک ضروری امر ہے کیونکہ سچی محبت دوسرے کے دل میں بھی محبت پیدا کر دیتی ہے۔

کہتے ہیں ''دل را بہ دل رہسیت''۔ جب کوئی شخص سچے دل سے کسی سے محبت کرتا ہے تو دوسرے کے دل میں بھی محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ بہر حال خدا تعالیٰ سے کوئی ایسی محبت نہیں ہوسکتی جس میں دونوں طرف جوڑ اور اِتصال نہ ہو۔ جیسے ماں اور بچہ اور خاوند اور بیوی میں محبت ہوتی ہے کہ ایک طرف ماں کے دل میں محبت ہوتی ہے اور دوسری طرف بچہ کے دل میں۔ ایک طرف خاوند اپنی بیوی سے محبت کرتا ہے تو دوسری طرف بیوی اپنے خاوند پر جان دیتی ہے۔ اِسی طرح بندے اور خدا کی محبت میں بھی ایک جوڑ اور تعلق ہوتا ہے۔ فرماتا ہے اِنۡ کُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ۔ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو تمہیں یاد رکھنا چاہیے کہ تمہاری یہ محبت تب ثابت ہوگی جب تم ہمارے بتائے ہوئے طریق کے مطابق محبت کرو گے اگر تم اُس طریق کے مطابق چلو گے تب ہم مانیں گے کہ تم ہم سے محبت کرتے ہو ورنہ نہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا تھا کہ ہمارے دل کی تو یہی خواہش ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ سے محبت کریں مگر ہم کریں کس طرح اس کا جواب یہ دیا کہ فَاتَّبِعُوۡنِیۡ یُحۡبِبۡکُمُ اللّٰہُ تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متبع بن جاؤ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگ جائے گا یہ محبت کسبی ہے۔ بندہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرے مگر اُس کے راستہ میں روک پیدا ہو جاتی ہے۔ تب خدا تعالیٰ کہتا ہے کہ یوں محبت کرو۔ پس ایک محبت وہ ہے جو بندے کی طرف سے شروع ہوتی ہے اور بعض ذرائع اختیار کر کے حاصل ہوتی ہے اور آخر اللہ تعالیٰ بھی اُس بندے سے محبت کرنے لگ جاتا ہے۔ یہ محبت کسبی کہلاتی ہے۔

یاد رہے کہ اس آیت میں فَاتَّبِعُوۡنِیۡ فرمایا ہے فَاَحِبُّوۡنِیۡ نہیں فرمایا کیونکہ

محبت جذبات سے تعلق رکھتی ہے اور جذبات اپنی مرضی سے پیدا نہیں کئے جا سکتے۔ جبر اور زور سے اعمال کئے جا سکتے ہیں۔ اِس لئے فرمایا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرو جو جبر سے کی جا سکتی ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگے گا اور اس محبت کے بدلہ میں تمہاری محبت جو خدا تعالیٰ سے ہے بڑھنے لگے گی۔

دوسری محبت موہبت کی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے اور بندہ کو گھیر لیتی ہے۔ اس محبت کے متعلق اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ۚ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ [۶۷]

اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ اے مومنو! اگر تم میں سے کوئی شخص مرتد ہو جائے گا تو اللہ تعالیٰ اُس کے بدلہ میں ایک ایسی قوم کو لے آئے گا جس سے وہ محبت کرے گا اور جو اُس سے محبت کرے گی یعنی پہلے اللہ تعالیٰ محبت کرے گا اور پھر وہ کریں گے گویا اُن کی محبت موہبت والی محبت ہوگی۔

یہاں سوال ہوسکتا ہے کہ جو مومن تھے اُن کی نسبت تو اللہ تعالیٰ نے یہ کہا کہ پہلے تم اتباعِ رسول کرو پھر تم خدا تعالیٰ کے محبوب ہو گے اور مرتدوں کے بدلہ میں جو کفار سے آنے والے تھے اُن کے متعلق یہ کہا کہ خدا اُن سے پہلے محبت کرے گا اور پھر وہ اس سے محبت کریں گے۔ اِس فرق کی وجہ کیا ہے اور کیوں مومنوں کی محبت کو کسبی اور مرتدوں کے بدلہ میں کفار میں سے آنے والوں کی محبت کو وہبی قرار

دیا ہے؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ بعض دفعہ کسی کو شرمندہ کرنے کے لئے دوسرے کو حق سے زیادہ انعام دیا جاتا ہے یا بعض دفعہ دوست کی ناشکری پر غیر پر زیادہ احسان کر دیا جاتا ہے تا کہ روٹھنے والے کو شرمندہ کیا جائے اور اپنا استغناء ظاہر کیا جائے۔ بعض دفعہ ہم اپنے کسی بچے کو بُلاتے ہیں اور کہتے ہیں آؤ ہم تمہیں مٹھائی دیں اگر وہ نہیں آتا تو پاس اگر غیر کا بچہ کھڑا ہو تو اُسے دوگنی مٹھائی دے دیتے ہیں تا کہ اپنا بچہ جو نہیں آیا وہ شرمندہ ہو۔ اسی طرح بعض دفعہ مومن مرتد ہوتا ہے اور چلا جاتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایسی حالت میں ہم خود کافروں میں سے چن چن کر بعض لوگوں کو لائیں گے اور پھر تمہیں دکھائیں گے کہ ہم اُن سے کیسا پیار کرتے ہیں گویا اس میں اصل مضمون مومنوں کو غیرت دلانا ہے۔ ورنہ خود مومنوں کے لئے بھی یہ مقام ہوتا ہے اور رسول تو سب کے سب اس دوسرے گروہ میں شامل ہوتے ہیں اور خدا کی خاص تربیت کے نیچے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء کے متعلق یہ مشہور ہے کہ اُن کا کوئی استاد نہیں ہوتا۔ لوگوں نے حماقت سے یہ سمجھ لیا ہے کہ اُن کو الف۔ ب پڑھانے والا بھی کوئی نہیں ہوتا حالانکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تعلق بِاللہ کے بنیادی اصول وہ کسی پیر اُستاد سے نہیں سیکھتے۔ اللہ تعالیٰ اُن کے دل میں یہ اصول خود ودیعت کرتا ہے اور خود اُنہیں روحانیت کے اسرار سے واقف کرتا ہے۔ پس نبی کا استاد نہ ہونے کا مفہوم صرف اتنا ہے کہ اُن کو روحانی علوم سکھانے والا کوئی استاد نہیں ہوتا۔ باقی لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کو لوگ سکھاتے ہیں جیسے میں اِس وقت لیکچر دے رہا ہوں اور آپ لوگ سن رہے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کو کس نے سکھایا تھا۔ ولید وغیرہ تو سب مشرک تھے اُن سے آپ نے محبت الٰہی کا کیا سبق سیکھنا تھا۔ آپؐ نے جو کچھ سیکھا براہِ راست اللہ تعالیٰ سے سیکھا۔ کوئی دُنیوی اُستاد ایسا نہیں تھا جس نے آپ کو روحانیت کے اِن رازوں سے آشنا کیا ہو۔ پس یہ درست ہے کہ نبی کا کوئی استاد نہیں ہوتا مگر اس کا مفہوم صرف یہ ہے کہ اُن کو محبت الٰہی کے راز سکھانے والا کوئی نہیں ہوتا۔ خدا خود اُن سے براہِ راست محبت کرتا اور براہِ راست اپنے علوم سے سرفراز فرماتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء کے متعلق قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ معصوم ہوتے ہیں اور معصوم ہونے کے معنی یہ ہیں کہ بلوغت سے پہلے ہی وہ معصوم ہوں کیونکہ عصمتِ کاملہ جو نبی کو حاصل ہوتی ہے وہ اُس وقت تک اُسے حاصل ہی نہیں ہو سکتی جب تک کہ تقویٰ اور محبت الٰہی اُس کے بلوغ بلکہ ہوش سے پہلے ہی موجود نہ ہو۔ جو اُسے بُرائیوں سے محفوظ رکھے اور یہ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اَلصَّبِیُّ صَبِیٌّ وَلَوْ کَانَ نَبِیّاً [۶۸] تو اس کے معنی صرف بچپن کے کھیل کود کے ہیں نہ کہ بغاوت وشرارت کے۔

اب میں قرآن کریم سے بتاتا ہوں کہ خدا تعالیٰ کن لوگوں سے محبت نہیں کرتا تا کہ انسان کوشش کرے کہ میں ویسا نہ بنوں۔ جب خدا تعالیٰ کہتا ہے کہ میں فلاں فلاں سے محبت نہیں کرتا تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ایسے آدمی کے دل میں خدا تعالیٰ کی محبت کبھی پیدا نہیں ہوسکتی۔ پس جن لوگوں میں یہ باتیں پائی جائیں گی وہ اِن امور کی موجودگی میں خدا تعالیٰ سے کبھی محبت نہیں کر سکتے اور نہ اُن کا یہ دعویٰ تسلیم کیا جا سکتا ہے (اگر وہ کہیں) کہ وہ خدا تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں۔ اِس میں کوئی

شُبہ نہیں کہ قرآن کریم کی آیات سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ فلاں فلاں شخص سے اللہ تعالیٰ محبت نہیں کرتا لیکن چونکہ یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ بندہ ایک قدم بڑھے تو خدا تعالیٰ دو قدم بڑھتا ہے اِس لئے اگر یہ ممکن ہوتا کہ وہ لوگ خدا تعالیٰ سے محبت کر سکتے تو یہ جواب غلط ہو جاتا کہ ایک قدم کے بدلہ میں خدا تعالیٰ دو قدم بڑھتا ہے۔ پس نتیجہ یہی نکلا کہ ایسے لوگ اللہ تعالیٰ سے محبت کر ہی نہیں سکتے اور جیسا کہ میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ عقل بھی اسی کی تائید کرتی ہے۔

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ دس قسم کے لوگوں سے اللہ تعالیٰ محبت نہیں کرتا یا دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ دس قسم کے لوگ اللہ تعالیٰ سے محبت نہیں کر سکتے۔

(۱، ۲) اوّل مختال سے اللہ تعالیٰ محبت نہیں کرتا اور دوسرے **فَخُوْرًا** سے اللہ تعالیٰ محبت نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے **اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا** [۲۹] جس شخص کے اندر کبر پایا جاتا ہے اور جس شخص کے اندر فخر کی عادت پائی جاتی ہے اُس سے خدا محبت نہیں کرتا یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لو کہ جس شخص کے اندر تکبر پایا جاتا ہے یا جس شخص کے اندر فخر کا مادہ پایا جاتا ہے وہ خدا تعالیٰ سے محبت نہیں کر سکتا۔ مختال اُس شخص کو کہتے ہیں جو اپنی اِتنی بڑی شان سمجھے کہ گویا سب مصائب سے محفوظ ہے اور **فَخُوْرًا** اُسے کہتے ہیں جسے یہ خیال ہو کہ میرے اندر ایسی خوبیاں پائی جاتی ہیں جو دوسروں میں نہیں اور انہیں طعنہ دے کر میرے جیسی خوبیاں دوسروں میں کہاں ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں خدا تعالیٰ سے محبت نہیں کر سکتے بلکہ درحقیقت کسی انسان سے بھی محبت نہیں

کر سکتے جس شخص کے اندر کبر پایا جاتا ہے اگر خدا تعالیٰ کی کبریائی کا اُسے کبھی خیال آ تا تو کیا وہ تکبر کرسکتا؟ جس کے سامنے بادشاہ کھڑا ہو کیا وہ اپنا سر اُونچا کرسکتا ہے۔ معمولی سپرنٹنڈنٹ پولیس بھی سامنے کھڑا ہو تو سپاہی ایسا مؤدب اور شریف بن کر کھڑا ہوتا ہے کہ گویا اُس کے منہ میں زبان ہی نہیں۔ پھر جو شخص خدا تعالیٰ کی کبریائی کا بھی خیال نہیں رکھتا اُس نے خدا تعالیٰ سے محبت کیا کرنی ہے۔ محبت یا تو حسن سے پیدا ہوتی ہے یا احسان سے۔ جب یہ اپنے آپ کو اتنی بڑی شان کا مالک خیال کرتا ہے کہ سمجھتا ہے میں سب مصائب سے محفوظ ہوں تو ذاتِ باری کا حسن یا اُس کا احسان اسے کس طرح نظر آ سکتا ہے۔ پس مختال سے خدا تعالیٰ محبت نہیں کرتا اور نہ ایسا شخص خدا تعالیٰ سے محبت کرسکتا ہے۔

اِسی طرح فخر بھی وہی کرتا ہے جو سمجھتا ہے کہ میرے اندر ایسی خوبیاں ہیں جو دوسروں میں نہیں اور وہ اُن خوبیوں کو اپنا ذاتی وصف قرار دیتا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کفار کہتے ہیں کہ ہمیں جس قدر نعمتیں حاصل ہیں یہ ہم نے اپنے زورِ بازو سے حاصل کی ہیں۔ پس فخر کے معنی یہ ہیں کہ انسان خدا تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار کرے اور کہے کہ اِن نعمتوں کا حصول میرا ذاتی وصف ہے اور جو شخص بھی ایسا کرتا ہے وہ خدا تعالیٰ کے حسن کا انکار کرتا ہے اور ایسے شخص سے اللہ تعالیٰ محبت نہیں کرتا۔

(۳) جس شخص کو اپنے کاموں میں حد سے گذر جانے کی عادت ہو اُس سے بھی اللہ تعالیٰ محبت نہیں کرتا۔ فرماتا ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ؁[۷] حد سے گذر جانے والوں سے خدا محبت نہیں کرتا یا یوں کہو کہ جو لوگ حد سے گذر جانے

والے ہوں وہ کبھی خدا تعالیٰ سے محبت نہیں کر سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسا شخص بھی طبعی طور پر خدا تعالیٰ سے محبت نہیں کر سکتا کیونکہ وہ اپنے حق کا مطالبہ کرنے میں حد سے بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ مثلاً کسی کو غصہ آ گیا اور اُس نے دوسرے کو تھپڑ مار دیا۔ اب یہ ایک غلطی ہے جس کی سزا اُسے ملنی چاہیے مگر یہ سزا اتنی ہی ہوسکتی ہے کہ ہم اُسے بُلائیں اور ڈانٹ دیں کہ تم نے فلاں کو تھپڑ کیوں مارا لیکن بعض طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جس شخص سے قصور سرزد ہوا ہو جب تک وہ اُس کا قیمہ نہ کرلیں اُن کی تسلی ہی نہیں ہوتی۔ ہمارے پاس بھی مختلف قسم کی رپورٹیں آتی رہتی ہیں اور ہم اُنہیں اُن کے قصور کے مطابق سزا دے دیتے ہیں۔ بعض دفعہ کسی سے غلطی ہو تو اُسے مثلاً ڈانٹ دیا جاتا ہے یا معمولی جرمانہ یا مسجد میں بیٹھ کر ذکر الٰہی کرنے کی سزا دے دی جاتی ہے۔ مگر جو اپنے کاموں میں حد کے اندر رہنے کے عادی نہ ہوں اُن کی اس سے تسلی ہی نہیں ہوتی وہ کہتے ہیں یہ بھی کیا سزا ہے کہ چار آنے جرمانہ کر دیا۔ اُن کا منشاء یہ ہوتا ہے کہ ہم اُس کے سر پر آرہ رکھ کر چلائیں۔ پھر اُس کی ہڈیاں جلا کر اُنہیں سِل پر پیسیں اور پھر کسی پاخانہ کے گڑھے میں اُس کی راکھ ڈال دیں اور پھر اُس پر ایک کتبہ لگا دیں جس میں اُس کو اور اُس کے باپ دادا کو گالیاں دی گئی ہوں اور پھر یہیں تک بس نہیں جب وہ اگلے جہان میں پہنچے تو وہاں بھی خدا اُس کو دوزخ میں ڈالے اور اُسے ایسا عذاب دے جو کسی اور کو نہ دیا گیا ہو حالانکہ خدا بڑا رحیم و کریم ہے۔ وہ حد سے زیادہ گذرنے والوں سے محبت نہیں کرتا اور نہ حد سے گذرنے والا خدا تعالیٰ سے محبت کر سکتا ہے۔

(۴) جو شخص خوان ہو یعنی طبیعت میں خیانت کا مادہ رکھتا ہو اُس سے بھی اللہ تعالیٰ

محبت نہیں کرتا۔ فرماتا ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنۡ کَانَ خَوَّانًا اَثِیۡمًا [1] محبت کہتے ہیں معاملہ کی درستی کو اور خوّان کے معنی ہیں بہت بڑا خائن۔ محبت کے معاملہ میں تو ایک چھوٹی سی خیانت بھی برداشت نہیں کی جاسکتی کجا یہ کہ کوئی شخص خوّان ہو اور پھر اُس سے محبت کی جاسکے۔ جو شخص بڑا خائن ہے وہ کسی صورت میں بھی محبت نہیں کرسکتا کیونکہ وہ تعلقات کو نباہ نہیں سکتا۔ ایسے شخص کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ خدا سے محبت کرے گا یا خدا اُس سے محبت کرے گا بالکل عقل کے خلاف ہے۔

(۵) اِسی طرح جو شخص اثیم ہو یعنی گناہ کی طرف کمال رغبت رکھتا ہو اُس سے بھی خدا تعالیٰ محبت نہیں کرتا۔ اثیم کی حالت ایسی ہی ہوتی ہے جیسے کوئی بڑا قانون شکن ہو اور جس شخص کو قانون شکنی کی عادت پڑی ہوئی ہو وہ جس طرح دنیا کے قانون توڑے گا اِسی طرح خدا تعالیٰ کے قانون بھی توڑے گا۔ اِسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مَنۡ لَّمۡ یَشۡکُرِ النَّاسَ لَمۡ یَشۡکُرِ اللّٰہ۔ [2] جو شخص یہ سوچتا رہے گا کہ میں نے اِس قانون کو توڑ لیا تو کیا حرج ہے، اُس قانون کو توڑ لیا تو کیا حرج ہے وہ خدا تعالیٰ کے قانون بھی توڑتا چلا جائے گا اور اُن کی اطاعت سے ہمیشہ گریز کرے گا۔

ہماری جماعت میں ایک شخص ہوا کرتا تھا جسے لوگ فلاسفر فلاسفر کہا کرتے تھے اب وہ فوت ہو چکا ہے اللہ تعالیٰ اُس کی مغفرت فرمائے۔ اُسے بات بات میں لطیفے سوجھ جاتے تھے جن میں سے بعض بڑے اچھے ہوا کرتے تھے۔ فلاسفر اُسے اِسی لئے کہتے تھے کہ وہ ہر بات میں ایک نیا نکتہ نکال لیتا تھا۔ ایک دفعہ روزوں کا

ذکر چل پڑا۔ کہنے لگا مولویوں نے یہ محض ڈھونگ رچایا ہؤا ہے کہ سحری ذرا دیر سے کھاؤ تو روزہ نہیں ہوتا۔ بھلا جس نے بارہ گھنٹے فاقہ کیا اُس نے پانچ منٹ بعد سحری کھالی تو کیا حرج ہوا۔ مولوی جھٹ سے فتویٰ دیتے ہیں کہ اُس کا روزہ ضائع ہو گیا۔ غرض اُس نے اِس پر خوب بحث کی۔ صبح وہ گھبرایا ہوا حضرت خلیفہ اوّلؓ کے پاس آیا۔ زمانہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا تھا مگر چونکہ حضرت خلیفہ اوّل ہی درس وغیرہ دیا کرتے تھے اس لئے آپ کی مجلس میں بھی لوگ کثرت سے آیا جایا کرتے تھے۔ آتے ہی کہنے لگا کہ آج رات تو مجھے بڑی ڈانٹ پڑی ہے۔ آپ نے فرمایا کیا ہوا؟ کہنے لگا رات کو میں یہ بحث کرتا رہا کہ مولویوں نے ڈھونگ رچایا ہوا ہے کہ روزہ دار ذرا سحری دیر سے کھائے تو اُس کا روزہ نہیں ہوتا۔ میں کہتا تھا کہ جس شخص نے بارہ گھنٹے یا چودہ گھنٹے فاقہ کیا وہ اگر پانچ منٹ دیر سے سحری کھاتا ہے تو حرج ہی کیا ہے۔ اِس بحث کے بعد میں سو گیا تو میں نے رؤیا میں دیکھا کہ میں نے تانی لگائی ہوئی ہے (فلاسفر جولاہا تھا اِس لئے خواب بھی اُسے اپنے پیشہ کے مطابق ہی آئی) دونوں طرف میں نے کیلے گاڑ دیئے ہیں اور تانی کو پہلے ایک کیلے سے باندھا اور پھر میں اُسے دوسرے کیلے سے باندھنے کے لئے لے چلا۔ جب کیلے کے قریب پہنچا تو دو انگلی وَرے سے تانی ختم ہوگئی۔ میں بار بار کھینچتا تھا کہ کسی طرح اسے کیلے سے باندھ لوں مگر کامیاب نہ ہو سکا اور میں نے سمجھا کہ میرا سارا سوت مٹی پر گر کر تباہ ہو جائے گا چنانچہ میں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ میری مدد کے لئے آؤ۔ دو اُنگلیوں کی خاطر میری تانی چلی۔ دو اُنگلیوں کی خاطر میری تانی چلی۔ اور یہی شور مچاتے مچاتے میری آنکھ کھل گئی۔ جب میں جاگا تو میں نے سمجھا کہ اس

رؤیا کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے مجھے مسئلہ سمجھایا ہے کہ دو اُنگلیوں جتنا فاصلہ رہ جانے سے اگر تانی خراب ہوسکتی ہے تو روزہ میں تو پانچ منٹ کا فاصلہ کہہ رہے ہو اُس کے ہوتے ہوئے کسی کا روزہ کس طرح قائم رہ سکتا ہے۔

وہ تو فلاسفر کا لطیفہ تھا جس نے یہ کہا تھا کہ اگر پانچ منٹ بعد سحری کھائی جائے تو کیا حرج ہے۔ راولپنڈی کے ایک مولوی کا قصہ مشہور ہے کہ اُس کا ایک شاگرد اُس کے پاس آیا اور کہنے لگا حضور! میں ایک مسئلہ دریافت کرنے آیا ہوں۔ اگر نماز پڑھتے ہوئے تھوڑی سی ہوا خارج ہو جائے تو کیا وضو قائم رہتا ہے یا ٹوٹ جاتا ہے؟ اُس نے کہا وضو تو ٹوٹ جائے گا۔ کہنے لگا آپ میرا مطلب سمجھے نہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر بہت تھوڑی سی ہوا خارج ہو تو کیا پھر بھی وضو ٹوٹ جائے گا؟ مولوی صاحب نے کہا تھوڑی کیا اور بہت کیا، ہوا خارج ہو جائے تو وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ اُس نے کہا مولوی صاحب آپ پھر بھی نہیں سمجھے اگر بہت ہی تھوڑی سی ہوا خارج ہو تو کیا پھر بھی وضو ٹوٹ جاتا ہے؟ مولوی صاحب نے کہا ایک دفعہ تو کہا ہے کہ وضو ٹوٹ جاتا ہے اور کیا کہوں۔ اِس پر اُس نے ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا کہ اگر اتنی سی ہوا خارج ہو تو کیا پھر بھی وضو ٹوٹ جائے گا؟ مولوی صاحب کو غصہ آ گیا اور اُنہوں نے کہا کمبخت! تیرا تو پاخانہ بھی نکل جائے تو وضو نہیں ٹوٹ سکتا۔ تو خوّان اور اشیم نے محبت کیا کرنی ہے وہ تو زیادہ سے زیادہ ایک فلسفی کہلا سکتا ہے اور کچھ نہیں۔

جہاں محبت ہوتی ہے وہاں انسان دلیلیں نہیں سوچتا بلکہ عمل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ تقریر فرما رہے تھے کہ آپؐ نے

دیکھا کہ کناروں پر کچھ لوگ کھڑے ہیں آپؐ نے اُنہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ بیٹھ جاؤ۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اُس وقت مسجد کی طرف آ رہے تھے ابھی آپ گلی میں ہی تھے کہ آپ کے کانوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ آواز پہنچی کہ بیٹھ جاؤ۔ آپ وہیں گلی میں بیٹھ گئے اور بچوں کی طرح گھسٹ گھسٹ کر مسجد کی طرف بڑھنے لگے۔ کسی شخص نے آپ کو دیکھا تو کہا عبداللہ بن مسعودؓ! تم ایسے عقلمند ہو کر یہ کیا حرکت کر رہے ہو کہ گلی میں بچوں کی طرح گھسٹ رہے ہو۔ اُنہوں نے کہا بات یہ ہے کہ مجھے ابھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ آواز آئی تھی کہ بیٹھ جاؤ اِس لئے میں بیٹھ گیا۔ اُس نے کہا آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم تو اُن لوگوں کے لئے تھا جو تقریر کے وقت کھڑے تھے۔ اُنہوں نے کہا مطلب تو میں بھی سمجھتا ہوں لیکن ڈرتا ہوں کہ ابھی میری جان نکل جائے تو میں خدا تعالیٰ کے حضور شرمندہ ہوں گا کہ ایک حکم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا بھی تھا جس پر میں نے عمل نہیں کیا۔[۳۷] پس جو شخص یہ کہتا ہے کہ میں نے حکم تو سنا ہے لیکن اس کا یہ مفہوم ہے وہ مفہوم ہے وہ فلسفی تو کہلا سکتا ہے لیکن محب نہیں۔ اِسی طرح اثیم جو کھلے بندوں قانون شکنی کرتا ہے اور جو گناہ کی طرف میل رکھتا ہے وہ بھی اچھے دوست کے ساتھ اپنے تعلقات کو نباہ نہیں سکتا۔ اور بُرے دوست سے حقیقی محبت یوں بھی مشکل ہوتی ہے۔ پس خوّان اور اثیم سے بھی خدا تعالیٰ محبت نہیں رکھتا یا یوں کہہ لو کہ خوّان اور اثیم بھی خدا تعالیٰ سے محبت نہیں کر سکتے۔

(۶) جو فرح ہو یعنی عارضی لذات پر کمال لذت محسوس کرتا ہو اُس سے بھی اللہ تعالیٰ محبت نہیں کرتا۔ فرماتا ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ[۳۸] جو شخص

چھوٹی چھوٹی چیزوں پر خوش ہو جائے اللہ تعالیٰ اُسے اپنی محبت کا مورد نہیں بنا سکتا۔ جو شخص کہتا ہے کہ میں نے خدا کی عبادت کی تھی میں تھانیدار بن گیا۔ میں نے فلاں تجارت کی اور اُس میں بڑا نفع ہوا اور اس خوشی میں اکڑا پھرتا ہے اور پتلون کے شکن ہر وقت درست کرتا رہتا ہے اُس نے خدا تعالیٰ کی محبت کیا حاصل کرنی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ چھوٹی چھوٹی کامیابیاں بھی اللہ تعالیٰ کے فضل کا نتیجہ ہوتی ہیں اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ ہمیں ہر خوشی اور ہر نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر کرنے کی تعلیم دی گئی ہے لیکن انسان اتنا پست ہمت کیوں بنے کہ وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں پر قانع ہو جائے اور بڑی کامیابیوں کا خیال اُس کے دل سے اُتر جائے۔ اُسے تو آسمان کے تارے توڑنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اپنے عزم کو اتنا بلند رکھنا چاہیے کہ ہر مطمح نظر اُسے نیچا دکھائی دے اور وہ سمجھے کہ ابھی میں نے اور اونچا اُڑنا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب براہین احمدیہ لکھی اور مولوی بُرہان الدین صاحب کو پہنچی تو اُنہوں نے آپؑ سے ملنے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ وہ جہلم سے قادیان آئے۔ اتفاقاً اُن دنوں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کہیں باہر تشریف لے گئے تھے شاید ہوشیارپور چلّہ کرنے کے لئے یا کسی اور جگہ۔ مولوی بُرہان الدین صاحب چونکہ اسی ارادہ سے آئے تھے کہ آپ سے ملیں گے اِس لئے وہ اُسی جگہ جا پہنچے جہاں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قیام تھا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے منع کیا ہوا تھا کہ کوئی شخص مجھ سے ملنے کیلئے نہ آئے۔ وہ شیخ حامد علی صاحب کے پاس پہنچے جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پُرانے خادم تھے اور سفروں میں آپ کے ساتھ رہتے تھے۔ مولوی صاحب بعد میں خود ہی سنایا کرتے تھے کہ میں

نے شیخ حامد علی صاحب کی بڑی منتیں کیں کہ کسی طرح میری ملاقات کرا دو مگر اُنہوں نے کہا میں کس طرح ملاقات کروا سکتا ہوں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ملاقاتیں بند کی ہوئی ہیں۔مگر میں نے اپنے دل میں سوچا کہ میں اِتنی دُور سے آیا ہوں اب میں بغیر آپ کو دیکھے کے واپس نہیں جاؤں گا چنانچہ میں وہیں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد شیخ حامد علی صاحب کسی کام کے لئے گئے تو میں دَوڑ کر آپ کے کمرہ کی طرف چلا گیا اور دروازہ کے آگے جو پردہ لٹکا ہوا تھا اُس کو ہٹا کر دیکھا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عادت تھی کہ آپ لکھتے ہوئے بھی ٹہلا کرتے تھے اُس وقت بھی آپ کوئی کتاب لکھ رہے تھے اور اِدھر سے اُدھر تیزی کے ساتھ ٹہلتے جاتے اور ساتھ ساتھ لکھتے جاتے تھے۔ میں نے جونہی آپ پر نظر ڈالی مجھے دیکھ کر اتنا ڈر آیا کہ پردہ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میں وہاں سے بھاگ نکلا۔ لوگوں نے مجھے دیکھا تو کہا ہمیں بھی کچھ بتایئے مرزا صاحب آپ سے ملے یا نہیں؟ میں نے کہا میں نے مرزا صاحب کو دیکھ لیا ہے بات تو میں نے آپ سے کوئی نہیں کی لیکن میں نے دیکھا کہ وہ کمرے کے اندر بھی اتنی جلدی جلدی ٹہل رہے تھے جیسے کسی نے بڑی دور جانا ہو اور وہ اپنے کام کو تیزی کے ساتھ ختم کرنا چاہتا ہو۔ اِس سے میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی منزل بہت دور ہے اور کوئی عظیم الشان مقصد ہے جو آپ کے سامنے ہے لیکن فَرِحَ یعنی تھوڑی تھوڑی چیز پر تسلی پا جانے والا دور کی کامیابیوں کو اپنا مقصد قرار ہی نہیں دے سکتا۔ اِس میں کوئی شُبہ نہیں کہ مومن پر اللہ تعالیٰ جب بھی کوئی احسان کرے گا وہ کہے گا۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ۔مگر ساتھ ہی کہے گا اِس انعام پر تو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ مگر میری منزل ابھی دور ہے پھر دوسرا انعام آئے گا

تو کہے گا۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ۔ خدایا تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھے اِس انعام سے سرفراز فرمایا مگر میں نے تو آپ کو لینا ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں میرا مقصود نہیں ہیں۔ اِس طرح وہ قدم بقدم آگے بڑھتا چلا جاتا ہے اور آخر وہ خدا تعالیٰ کو پا لیتا ہے۔

(۷) جو شخص مفسد ہو اللہ تعالیٰ اُس سے بھی محبت نہیں کرتا۔ فرماتا ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُفْسِدِیْنَ[۵۷] مفسد سے میں محبت نہیں کرتا۔ سیدھی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کا خالق اور اُس کا ربّ ہے۔ جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں فساد برپا کرنے کی کوشش کرے گا تو اُس مخلوق کا خالق اور ربّ فساد کرنے والے سے کس طرح محبت کرے گا۔ اگر کسی بچہ سے انسان کو نفرت ہو تو اُس کی ماں کبھی نفرت کرنے والے سے پیار نہیں کرسکتی۔ جب تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کی ہے تو صاف ظاہر ہے کہ جو شخص فساد ڈلواتا ہے اور لوگوں کی آپس میں لڑائیاں کرواتا رہتا ہے خدا تعالیٰ اُسے کبھی پسند نہیں کرسکتا۔

انگریزی میں ایک حکایت مشہور ہے کہ کسی شخص کو ایک عورت سے عشق ہو گیا۔ وہ عورت بیوہ تھی اور وہ اُس سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر یوروپین طریق کے مطابق خالی پیغام سلام سے شادی نہیں ہوسکتی تھی ضروری تھا کہ پہلے اُسے اپنی طرف متوجہ کیا جائے کہ یورپ کے لوگوں میں مرد و عورت کی دوستی کے بعد شادی ہوتی ہے پہلے نہیں۔ پس وہ اُسے اپنی طرف راغب کرنے کی بڑی کوشش کرتا مگر اُسے کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ آخر اُس نے اپنے کسی دوست سے ذکر کیا کہ مجھے اِس اِس طرح فلاں عورت سے عشق ہے اور میں اُس سے شادی کرنا چاہتا ہوں مگر وہ میری طرف توجہ ہی نہیں کرتی۔ اس نے کہا عورت کا کوئی بچہ ہے یا نہیں؟ اُس نے کہا کہ

بچہ تو ہے۔ اُس نے کہا تو پھر محبت میں کونسی مشکل ہے بچہ کو اُٹھا کر اُس سے چند دن پیار کرو عورت تم سے خودبخود بے تکلّف ہو جائے گی۔ تو جس سے کسی کو محبت ہو اُس سے نفرت رکھنے سے کبھی اُس شخص کی محبت حاصل نہیں کی جا سکتی۔ اِسی لئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ

خاکم نثار کوچۂ آلِ محمد است

اب آلِ محمدؐ میں سے اچھے بھی ہوتے ہیں اور بُرے بھی۔ مگر اس وجہ سے کہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کے ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے حصول کا ایک طریق یہ بھی ہے کہ انسان اُن سے محبت کرے۔ یہ خیال کرنا کہ آلِ محمدؐ سے بے شک محبت نہ ہو لیکن محمد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت مجھے حاصل ہو جائے گی غلط ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ۔ اگر تم فساد کرو گے تو تمہیں یاد رکھنا چاہیے کہ خدا تم سے محبت نہیں کرے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندے پیارے ہیں جو اُن سے محبت نہ کرے اور اُن کا بدخواہ ہو، نہ اللہ تعالیٰ اُس سے محبت کرسکتا ہے اور نہ وہ اللہ تعالیٰ سے۔

(۸) جو شخص ناشکرا ہو وہ بھی اللہ تعالیٰ سے محبت نہیں کرسکتا اور نہ اللہ تعالیٰ اُس سے محبت کرسکتا ہے کیونکہ محبت کا ایک ذریعہ احسان ہے۔ جو شخص شکرگزار نہیں اِس کے معنی یہ ہیں کہ وہ احسان کو نہیں دیکھ سکتا اور جو احسان کو نہیں دیکھ سکتا وہ خدا تعالیٰ سے محبت بھی نہیں کرسکتا کیونکہ اُس سے محبت کا پہلا دروازہ احسان ہی ہے۔ وہ فرماتا ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ[۶۷] خوان کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ کَفُوْر

کے معنی ہیں ایسا انسان جو خدا تعالیٰ کے انعامات کو دیکھتا ہے اور پھر بھی اُس کے اندر شکر گزاری کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا گویا احسان شناسی کا مادہ اُس کے اندر ہوتا ہی نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جو شخص خدا تعالیٰ کے احسانات کو دیکھتا ہی نہیں۔ کہتا ہے مجھے کچھ نہیں ملا اُسے اور کیا مل سکتا ہے۔ اُس سے تو اللہ تعالیٰ اگر محبت بھی کرے گا تو وہ کہہ دے گا کہ مجھے کچھ نہیں ملا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ ایک دوسرے مقام پر فرماتا ہے کہ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ [۷۷] تم جتنا جتنا شکر کرو گے میں اُتنا ہی اپنے انعامات کو بڑھاتا چلا جاؤں گا اور جتنی جتنی ناشکری کرو گے اتنی ہی میں اپنے انعامات میں کمی کردوں گا۔

(۹) جو شخص مُسرف ہو اُس سے بھی اللہ تعالیٰ محبت نہیں کرتا۔ فرماتا ہے اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ۔ [۷۸] مسرف سے بھی اللہ تعالیٰ محبت نہیں رکھتا کیونکہ مسرف اپنے اور اپنے نفس کی لذات کو دوسرے کی تکلیف اور آرام پر ترجیح دیتا ہے اور جو شخص خدا تعالیٰ کے بندوں پر خرچ کرنا پسند نہیں کرتا اپنے نفس پر بِلا وجہ خرچ کرتا چلا جاتا ہے اُسے کون پسند کرسکتا ہے۔ احادیث میں آتا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بعض لوگوں سے کہے گا کہ آؤ میں تم پر اپنے انعامات نازل کروں کیونکہ میں بھوکا تھا تم نے مجھے کھانا کھلایا۔ میں پیاسا تھا تم نے مجھے پانی پلایا۔ میں ننگا تھا تم نے مجھے کپڑا پہنایا۔ میں بیمار تھا تم نے میری عیادت کی۔ تب بندے اللہ تعالیٰ سے کہیں گے کہ خدایا! یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ تو بھوکا اور پیاسا اور ننگا اور بیمار ہو۔ ہماری سمجھ میں تو یہ بات نہیں آئی۔ اللہ تعالیٰ اُن سے کہے گا جب دنیا میں میرے غریب بندوں میں سے کسی بھوکے کو تم نے کھانا کھلایا تو تم نے اُسے کھانا نہیں کھلایا، مجھے

کھلایا۔ اور جب تم نے کسی پیاسے کو پانی پلایا تو تم نے اُسے پانی نہیں پلایا بلکہ مجھے پانی پلایا اور جب تم نے کسی ننگے کو کپڑے دیئے تو تم نے اُس کو کپڑے نہیں دیئے بلکہ مجھے کپڑے دیئے اور جب تم نے میرے بیمار بندوں کی عیادت کی تو تم نے اُن کی عیادت نہیں بلکہ میری عیادت کی۔ اِس کے بعد وہ دوسری طرف کے لوگوں سے مخاطب ہوگا اور کہے گا میں بھوکا تھا مگر تم نے مجھے کھانا نہ کھلایا۔ میں پیاسا تھا مگر تم نے مجھے پانی نہ پلایا۔ میں ننگا تھا مگر تم نے مجھے کپڑا نہ دیا۔ میں بیمار تھا مگر تم نے میری عیادت نہ کی تب وہ بھی اسی طرح کہیں گے کہ خدایا! تو تو زمین و آسمان کا مالک اور سب کا خالق ہے تو بھلا کب بیمار ہوسکتا ہے، کب بھوکا اور پیاسا اور ننگا ہوسکتا ہے۔ اُس وقت اللہ تعالیٰ اُن سے کہے گا کہ دنیا میں میرے کچھ ایسے بندے تھے جو بھوکے تھے، کچھ ایسے بندے تھے جو پیاسے تھے، کچھ ایسے بندے تھے جو ننگے تھے، کچھ ایسے بندے تھے جو بیمار تھے مگر تم نے اُن کی پرواہ نہ کی۔ نہ تم نے بھوکوں کو کھانا کھلایا، نہ پیاسوں کو پانی پلایا، نہ ننگوں کو کپڑا دیا، نہ بیماروں کی عیادت کی۔ پس تم نے اُن بندوں کے ساتھ یہ سلوک نہیں کیا بلکہ میرے ساتھ یہ سلوک کیا ہے کیونکہ وہ میرے بندے تھے۔[۹۷] تو اللہ تعالیٰ جن لوگوں کی مدد کے لئے ہمیں روپیہ دیتا ہے، ہمیں علم دیتا ہے، ہمیں عزت اور شہرت دیتا ہے اگر ہم اپنے روپیہ اور علم اور عزت اور شہرت سے اُن کی مدد نہیں کرتے بلکہ صرف اپنے نفس کی لذات میں ہی منہمک رہتے ہیں تو ہم کیا امید کر سکتے ہیں کہ ہمارا خدا ہم سے محبت کرے گا اور جب وہ ہم سے محبت نہیں کرے گا تو ہم اُس سے کس طرح محبت کر سکتے ہیں۔

(۱۰) جو شخص ظالم ہو اُس سے بھی اللہ تعالیٰ محبت نہیں کرتا۔ فرماتا ہے **وَاللّٰہُ**

لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۸۰ ظالموں سے اللہ تعالیٰ محبت نہیں کرتا۔گویا ظلم اور محبت جمع نہیں ہو سکتے۔ جو شخص ظلم کرتا ہے اُسے درحقیقت اپنی ذات کی محبت سب سے زیادہ ہوتی ہے اور جسے اپنی ذات کی محبت سب سے زیادہ ہو وہ دوسرے سے محبت نہیں کر سکتا۔علاوہ ازیں یہ قطعی طور پر ناممکن ہے کہ کوئی شخص خدا تعالیٰ کے بندوں پر تو ظلم کرے اور اللہ تعالیٰ سے محبت کرے پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ محبت جذبہ ہے نرمی کا اور ظلم جذبہ ہے سختی کا۔محبت کہتی ہے اپنی چیز قربان کر اور ظلم کہتا ہے دوسرے کی چیز قربان کر۔ پس یہ دو مخالف جذبات ہیں اِس لئے جو شخص ظالم ہے نہ وہ خدا تعالیٰ سے محبت کرسکتا ہے اور نہ خدا تعالیٰ اُس سے محبت کرتا ہے۔

یہ دس عدد اخلاق اور بُرائیاں جس شخص میں ہوں فرداً فرداً یا مجتمع طور پر وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے کے ناقابل ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اُس سے محبت نہیں کر سکتا۔مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جس میں یہ عیب نہ ہوں وہ اللہ تعالیٰ سے ضرور محبت کرتا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس میں یہ عیب نہ ہوں اُس میں اللہ تعالیٰ کی محبت کی قابلیت ہوتی ہے۔ پس اِن باتوں کے یہ معنی نہیں کہ جن لوگوں میں یہ باتیں نہ ہوں وہ خدا تعالیٰ سے محبت کرنے لگ جاتے ہیں۔ بلکہ مراد صرف یہ ہے کہ جن لوگوں میں یہ باتیں ہوں وہ خدا تعالیٰ سے محبت نہیں کر سکتے اور نہ خدا تعالیٰ اُن سے محبت کرتا ہے۔لیکن اگر اُن میں یہ باتیں نہ ہوں تو اُن کے لئے اِمکان ہے کہ وہ خدا تعالیٰ سے محبت کرسکیں۔ یہ معنی نہیں کہ وہ ضرور اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں۔مثلاً جو شخص ظالم ہے وہ اللہ تعالیٰ سے محبت نہیں کرسکتا۔مگر جو ظالم نہیں ضروری نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہو۔ممکن ہے وہ سخت دل ہو یا پاگل

ہو اور اُس کے اندر محبت پیدا ہی نہ ہوسکی ہو۔ پس نتیجہ صرف یہ نکلتا ہے کہ ظلم کے ہوتے ہوئے محبت نہیں ہوسکتی۔ یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ ظلم نہ ہو تو محبت ضرور ہوگی۔ ایک شخص جو مسرف نہیں اُس میں قابلیت ہے محبت کرنے کی مگر ضروری نہیں کہ وہ محبت کرے۔ اِسی طرح وہ شخص جو خوّان اور اثیم نہیں اُس میں قابلیت ہے کہ اگر وہ چاہے تو اللہ تعالیٰ سے محبت پیدا کر لے مگر ضروری نہیں کہ وہ محبت کرے۔ جب تک وہ خوّان اور اثیم تھا اس کے لئے محبت کرنا ناممکن تھا جب وہ خوّان اور اثیم نہ رہا تو محبت کرنا اس کے لئے ممکن ہوگیا۔ گویا ان صفات میں منفی کی طاقت ہے اِن کے عدم میں مثبت طاقت نہیں۔

اب میں بتاتا ہوں کہ محبت الٰہی پیدا کرنے کے لئے کن ذرائع کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔ سو یاد رکھنا چاہیے کہ

اوّل صفاتِ الٰہی کا ورد کرنے سے، جسے ذکر کہتے ہیں محبت پیدا ہوتی ہے یعنی **سُبْحَانَ اللہِ، اَلْحَمْدُلِلّٰہِ، اللّٰہُ اَکْبَرُ** اور اِسی طرح **یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ یَا سَتَّارُ یَا غَفَّارُ** وغیرہ وغیرہ۔ ننانوے اسمائے الٰہیہ عام طور پر قرار دیئے جاتے ہیں۔ بعض نے سَو یا ایک سَو ایک نام بھی لکھے ہیں مگر ہیں وہ بہت زیادہ۔ بہرحال صفاتِ الٰہیہ کے ذکر کرنے سے محبت الٰہیہ پیدا ہوتی ہے یا یوں کہنا چاہیے کہ یہ سب سے پہلا درجہ ہے اِس لئے کہ یہ تکلّف کا درجہ ہے۔ ہم کہتے ہیں **سُبْحَانَ اللہِ**۔ ہم کہتے ہیں **اَلْحَمْدُلِلّٰہِ**۔ ہم کہتے ہیں **اللّٰہُ اَکْبَرُ**۔ اور اس طرح اللہ تعالیٰ کا نام لیتے اور اُس کی صفات کا بار بار ذکر کرتے ہیں لیکن نام لینے سے یقین اور ایمان میں ترقی نہیں ہوتی۔ ہم ایک مضمون تو اپنے سامنے لاتے ہیں مگر یہ کہ ہمارا قلب بھی اُس مضمون کو تسلیم کر لیتا ہے یا

نہیں یہ دوسری بات ہے۔ ہم ایمان لے آئے خدا کی باتوں پر۔ ہم ایمان لے آئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں پر اور ہم نے کہا خدا بڑا غفار ہے۔ خدا بڑا ستار ہے یا خدا بڑی شان کا مالک ہے یہ ہمارے دماغ کی تسلی کا تو ثبوت ہے لیکن ہمارے دل کی تسلی کا ثبوت نہیں۔ ہم جب سُبۡحَانَ اللّٰہِ کہتے ہیں یا اَلۡحَمۡدُلِلّٰہِ کہتے ہیں یاسَتَّار اور غَفَّار کہتے ہیں تو ایک عقلی چیز اپنے سامنے لاتے ہیں اور عقلی چیز کا لازمی نتیجہ محبت نہیں ہوتی۔ مثلاً ہم شیر کو مانتے ہیں مگر شیر کے ماننے سے محبت پیدا نہیں ہو جاتی۔ اِسی طرح ہم انگلینڈ اور امریکہ کا بار بار ذکر سنتے ہیں تو انگلینڈ اور امریکہ سے محبت نہیں کرنے لگ جاتے۔ اِسی لئے اِس کو ذِکر کہتے ہیں یعنی یہ تکلّف اور بناوٹ کی محبت ہے۔ جیسے اقلیدس والا کہتا ہے کہ فرض کرو یہ لکیر فلاں لکیر کے برابر ہے۔ اِس طرح وہ فرض سے شروع کرتا ہے اور سچائی کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ ایک شخص مصنوعی طور پر رونا شروع کرتا ہے تو آہستہ آہستہ سچ مچ رونے لگ جاتا ہے۔ کئی مائیں اپنے بچوں کو ڈرانے لگتی ہیں تو بعد میں وہ خود بھی ڈرنے لگ جاتی ہیں۔

عربوں میں ایک قصہ مشہور ہے کہ کوئی لڑکا تھا جسے باقی لڑکے سخت تنگ کرتے اور اُسے مارتے رہتے تھے۔ جب وہ بہت ہی تنگ آ جاتا تو اُن سے پیچھا چھڑانے کے لئے کہتا کہ تمہیں کچھ پتہ بھی ہے آج فلاں رئیس کے ہاں ولیمہ کی دعوت ہے۔ یہ سنتے ہی بچے اُس طرف دَوڑ پڑتے اور اِسے چھوڑ دیتے۔ اُن کے جانے کے بعد اس کے دل میں خیال آتا کہ شاید وہاں سچ مچ دعوت ہو اور یہ لڑکے کھا آئیں اور میں محروم رہ جاؤں اس خیال کے آنے پر وہ خود بھی اُسی طرف بھاگ پڑتا۔ ابھی وہ نصف راستہ میں ہی ہوتا کہ لڑکے ناکام واپس آ رہے ہوتے اور وہ غصہ میں اُسے

پھر پکڑ لیتے اور خوب مارتے ۔ جب وہ بہت ہی تنگ آ جاتا تو پھر اپنا پیچھا چھڑانے کے لئے چاہتا کہ اُنہیں کوئی دھوکا دے ۔ چنانچہ وہ اُن سے کہتا کہ اصل میں میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا دعوت اُس رئیس کے ہاں نہیں تھی بلکہ فلاں رئیس کے ہاں تھی ۔ یہ سن کر لڑکے اُس دوسرے رئیس کے مکان کی طرف دوڑ پڑتے ۔ مگر اُن کے جانے کے بعد پھر اُس کے دل میں شبہ پیدا ہوتا کہ گو میں نے دھوکا دیا ہے مگر شاید اُس رئیس کے ہاں دعوت ہی ہو ۔ اِس خیال کے آنے پر وہ خود بھی اُسی طرف دَوڑ پڑتا اور خود بھی دھوکا کھا جاتا ۔

تو بسا اوقات بناوٹ سے بھی یقین پیدا ہو جاتا ہے ۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اگر کوئی نماز میں رونے والی شکل بنائے تو آہستہ آہستہ اُسے رونا آ جاتا ہے ۔ پس ذکرِ الٰہی تصنع والی محبت کا مقام ہے ۔ اصل میں اِس کا دماغ خدا کو سُبْحَان مانتا ہے ۔ اِس کا دماغ خدا کو ستار اور غفار مانتا ہے ۔ اس کا اپنا جوڑ خدا تعالیٰ سے نہیں ہوتا لیکن جب یہ کہنا شروع کرتا ہے کہ یا ستار یا غفار تو محبت الٰہی کا کوئی نہ کوئی چھینٹا اِس پر بھی آ پڑتا ہے ۔ جیسے کیچڑ اُچھالا جائے تو کچھ کیچڑ اپنے اوپر بھی آ پڑتا ہے یا شکر کی بوری بھرتے ہیں تو شکر کے چند دانے بوری بھرنے والے کے منہ میں بھی چلے جاتے ہیں ۔ غرض اِسی طرح ہوتے ہوتے یہ مصنوعی محبت حقیقی محبت کا رنگ اختیار کر لیتی ہے ۔ اِسی کی طرف اللہ تعالیٰ اِس آیت میں اشارہ فرماتا ہے کہ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ[۸۱] تم میرا ذکر کیا کرو گے تو ہوتے ہوتے ایسا مقام تمہیں حاصل ہو جائے گا کہ میں تمہیں یاد کرنے لگ جاؤں گا ۔

(۲) **دوسرا** ذریعہ صفاتِ الٰہیہ پر غور کرنا ہے جسے صوفیاء کی اصطلاح میں فکر

کہا جاتا ہے۔ ایک ہے سُبۡحَانَ اللہِ اَلۡحَمۡدُلِلّٰہِ اور اَللّٰہُ اَکۡبَرُ کہنا اور ایک ہے سوچنا اور غور کرنا کہ خدا سُبۡحَانَ کس طرح ہے۔ خدا اَکۡبَرُ کس طرح ہے، خدا تمام تعریفوں اور محامد کا مستحق کس طرح ہے۔ یہ جو دماغ میں صفاتِ الٰہیہ کا دَور کیا جاتا اور اُن کا ایک رنگ میں آپریشن کیا جاتا ہے اِس کو فکر کہتے ہیں۔ خالی اَللّٰہُ اَکۡبَرُ کہنا ذکر ہے لیکن اَکۡبَرُ پر بحث شروع کر دینی کہ اللہ کس طرح بڑا ہے یہ فکر ہے۔ جب انسان فکر کرے گا تو اس کے سامنے سوال آئے گا کہ اللہ کس طرح بڑا ہوا؟ آج تو امریکہ سب سے بڑا ہے ہم دیکھتے ہیں کہ جو کچھ بھی امریکہ کرتا ہے وہی ساری دنیا کرنے لگ جاتی ہے اور مسلمان اپنی حکومتوں کے باوجود اس کے مقابلہ میں کچھ نہیں کر سکتے۔ جب وہ سوچے گا تو اُسے خود ہی یہ جواب سمجھ آئے گا کہ امریکہ کو جو بڑائی ملی ہے یہ اُسے کس نے دی ہے اور کیوں دی ہے۔ جب وہ غور کرے گا تو اُسے معلوم ہوگا کہ امریکہ کو خدا نے ہی بڑائی دی ہے اور اس لئے بڑائی دی ہے کہ اُس نے فلاں فلاں اعمال کئے اور مسلمان اس لئے گر گئے کہ اُنہوں نے اُن اعمال کو ترک کر دیا۔ غرض اس طرح جب وہ سوچے گا تو اس کا دل اِس یقین اور ایمان سے لبریز ہو جائے گا کہ اکبر اللہ ہے امریکہ نہیں۔ اِس غور اور تدبر کو فکر کہتے ہیں اور یہ مقام تفصیل کا مقام ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ عَلَیۡكُمۡ اِذۡ هَمَّ قَوۡمٌ اَنۡ یَّبۡسُطُوۡۤا اِلَیۡكُمۡ اَیۡدِیَهُمۡ فَكَفَّ اَیۡدِیَهُمۡ عَنۡكُمۡ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلۡیَتَوَكَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ [۸۲] اے مومنو! یاد کرو میرے ناموں کو نہیں، میری صفات کو نہیں بلکہ نِعۡمَتَ اللّٰهِ عَلَیۡكُمۡ جو انعام میں نے تم پر اپنی کسی خاص صفت کے ماتحت

کئے ہیں اُن کی تفصیلات پر غور کرو۔ یہ نہ سوچو کہ میں نے تمہیں کھانا دیا اور کپڑے دیئے بلکہ یہ سوچو کہ دنیا تمہارے لئے کیا کر رہی تھی اور میں نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ کس طرح ایک قوم تمہیں تباہ کرنے کے لئے اُٹھی اور اُس نے اپنی ساری قوتیں تمہارے خلاف جمع کر لیں۔ کیا کیا قدرتیں تھیں جو اُس کو حاصل تھیں فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ لیکن پھر اللہ تعالیٰ نے اُس کے سارے منصوبوں میں اُس کے ہاتھ روک دیئے اور تمہیں اُس کے حملوں سے محفوظ کر دیا۔ یہ فکر ہے جو اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کرتا ہے یعنی خالی زبان سے رحمٰن یا رحیم نہ کہا جائے بلکہ یہ سوچا جائے کہ تم بیماری سے مرنے لگے تھے، سارے حالات تمہارے خلاف جمع تھے مگر پھر اللہ تعالیٰ نے تمہیں بچا لیا اور تمہیں صحت عطا کر دی۔ فرض کرو کوئی شخص جنگل میں جا رہا ہے اور وہ کسی ایسی بیماری میں مبتلا ہو گیا ہے جس میں آپریشن ضروری ہے تو ایسی حالت میں اگر اچانک گھوڑے پر سوار کوئی ڈاکٹر اُس کے پاس آ جاتا ہے اور وہ اُس کا علاج کرتا ہے جس سے وہ اچھا ہو جاتا ہے تو ہر شخص سمجھے گا کہ یہ ڈاکٹر نہیں آیا بلکہ خدا اپنے بندہ کے پاس چل کر آیا ہے۔ ایسے ہی نشانات ہوتے ہیں جو انسان کو کھینچ کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں لے جاتے ہیں اور اُسے فرش سے اُٹھا کر عرش تک پہنچا دیتے ہیں اور انہی نشانات پر غور انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کر دیتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اوپر کی آیت میں اِسی طرف توجہ دلائی ہے کہ تم غور کرو اور سوچو کہ آیا تمہارے ساتھ، تمہارے دوستوں کے ساتھ یا تمہارے بزرگوں اور عزیزوں کے ساتھ ایسے

واقعات گزر رہے ہیں یا نہیں جن میں اُس کی قدرت کا ہاتھ دکھائی دیتا تھا۔ جب تم ایسے واقعات پر غور کرو گے تو تمہارے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہو جائے گی۔ یہ پہلے مقام سے اونچا مقام ہے۔ ذکر میں تکلّف پایا جاتا ہے لیکن فکر میں تکلّف نہیں ہوتا بلکہ ایک حقیقت سامنے ہوتی ہے۔

(۳) **تیسرے** مخلوقِ الٰہی کی خیر خواہی اور اُس سے محبت کرنے سے بھی اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ وہ طریق ہے جس میں انسان خدا تعالیٰ کو ایک رنگ میں مجبور کرتا ہے کہ میرے دل میں اپنی محبت ڈال۔ جیسے تم خدمت اور محبت سے دوسرے کے دل میں محبت پیدا کر دیتے ہو۔ تم ریل میں سفر کرتے ہو کمرہ میں سخت بھیڑ ہوتی ہے تمہارے لئے بیٹھنے کو کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ ایک شخص گلا پھاڑ پھاڑ کر کہہ رہا ہوتا ہے کہ کمبخت یہ ریل ہے یا ڈربہ۔ جو آتا ہے اِسی ڈبہ میں آ جاتا ہے۔ اُس وقت اگر تم ایک کیلا نکال کر اُس شخص کے بچہ کو دے دو تو اُسی وقت اُس کا غصہ جاتا رہے گا اور وہ کہے گا تشریف رکھئے اور پھر وہ تم سے محبت کے ساتھ باتیں کرنے لگ جائے گا تو اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرنے کے لئے مخلوقِ الٰہی سے اگر نیک سلوک کرو تو اللہ میاں تم سے آپ کہیں گے کہ آؤ میاں میرے پاس بیٹھو۔ اصلی صوفیاء نے اِسی کا نام عشق مجازی رکھا تھا لیکن جھوٹے صوفیاء نے افراد کی محبت اور اُن سے عشق کا نام عشق مجازی رکھ لیا۔ حالانکہ جب صوفیاء نے یہ کہا تھا کہ عشق حقیقی پیدا کرنے کے لئے عشق مجازی ضروری ہے تو اُن کا مطلب صرف یہ تھا کہ بندوں کی حقیقی محبت کے بغیر اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل نہیں ہوسکتی۔ نہ یہ کہ کسی حسین لڑکے یا حسین عورت سے جب تک محبت نہ کی جائے اللہ تعالیٰ بھی انسان سے محبت نہیں کر

سکتا۔ یہ ایک نہایت ہی اعلیٰ درجہ کا نکتہ تھا جسے گندی شکل دے کر جاہلوں اور اوباشوں نے دین کی ہتک کی اور اپنی ہوس رانی کی راہ نکال لی۔ درحقیقت یہ محبت بسیط ہے یعنی کسی خاص شخص کی محبت نہیں بلکہ بنی نوع انسان بلکہ مخلوقات کا تصور کر کے یہ خیال کرنا کہ یہ میرے خدا کے پیارے ہیں مجھے خدا تعالیٰ تو نہیں ملتا چلو میں اِن سے محبت کروں اس محبت کا سرچشمہ ہے ایسی محبت کرتے کرتے یکدم محبت الٰہی شُعلہ مار کر تیز ہو جاتی ہے پس بے شک یہ درست ہے کہ عشق مجازی کے بغیر عشق حقیقی پیدا نہیں ہوسکتا لیکن عشق مجازی کے صرف اس قدر معنی ہیں کہ جب تک انسان بنی نوع انسان کی محبت اور اُن کے لئے قربانی اور ایثار کا مادہ اپنے اندر پیدا نہیں کرتا اُس وقت تک خدا تعالیٰ اُس سے محبت نہیں کرسکتا۔ اِس لئے صوفیاء نے کہا ہے کہ بنی نوع انسان خدا کے عیال ہیں جس طرح تمہیں اپنے بچوں سے محبت ہے اِسی طرح خدا کو بھی اپنی مخلوق سے محبت ہے۔ پس مخلوق سے محبت کر کے خدا کی محبت بھی پیدا ہوتی ہے اور خدا کی محبت سے مخلوق کی محبت بھی پیدا ہوتی ہے۔

حدیثوں میں آتا ہے کہ جب بارش نازل ہوتی تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحن میں تشریف لاتے اور اپنی زبان نکال کر اُس پر بارش کا قطرہ لیتے اور فرماتے یہ میرے ربّ کی طرف سے تازہ نعمت آئی ہے [۸۳] (اس موقع پر حضور نے اپنی زبان باہر نکالی اور فرمایا۔ اس طرح۔ پھر فرمایا) میرے زبان نکالنے پر ممکن ہے تم میں سے بعض یہ خیال کرتے ہوں کہ میں نے تہذیب کے خلاف حرکت کی ہے جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان نکالی تھی تو اُس وقت بھی بعض ایسے ہی خیالات رکھنے والے لوگ کہتے ہوں گے کہ یہ کیسی تہذیب کے خلاف

بات ہے مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے اعتراضات کی پرواہ نہیں کی اور فرمایا میرے ربّ کی طرف سے یہ تازہ نعمت آئی ہے میں کیوں نہ اِسے اپنی زبان پر لے لوں۔ اُس وقت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بارش کا قطرہ اپنی زبان پر نہیں لیا بلکہ درحقیقت خدا کی نعمت لی اور میں نے بھی اپنی زبان نکال کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہہ ایک فعل کیا ہے تاکہ تمہیں یہ احساس ہو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کی نعمتوں کی کس طرح قدر کیا کرتے تھے۔ اِسی مفہوم پر وہ آیت دلالت کرتی ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق آتی ہے کہ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ [۸۴] اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا تو اپنے آپ کو اِس غم میں ہلاک کرلے گا کہ میرے یہ بندے ایمان نہیں لائے؟ گویا خیال کر کے کہ یہ مجھ سے دور ہیں اور میرے لئے ناخوشی کا موجب ہیں تُو آپ مرا جا رہا ہے۔ اس طرح سے بین السطور اِس آیت کا یہ ہے کہ جب تو میری مخلوق کے غم میں مرا جا رہا ہے تو میں تجھ سے پیار کیوں نہ کروں۔ دنیا میں اور لوگ بھی لوگوں کے مؤمن نہ ہونے پر غم کرتے ہیں مگر اُن کا غم اُن کے ہدایت نہ پانے پر نہیں ہوتا بلکہ اپنی بات کی ناکامی پر ہوتا ہے اور دونوں غموں میں بڑا بھاری فرق ہے ایک میں غصہ ہوتا ہے اور ایک میں رنج۔

پھر جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں حدیث قدسی میں آتا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بعض بندوں سے کہے گا کہ جب میں بھوکا تھا تو تم نے مجھے کھانا کھلایا۔ جب میں پیاسا تھا تو تم نے مجھے پانی پلایا اور جب میں بیمار تھا تو تم نے میری عیادت کی۔ بندے کہیں گے کہ خدایا! تو کب بھوکا ہوا کہ ہم تجھے کھانا کھلاتے۔ تو کب پیاسا ہوا

کہ ہم تجھے پانی پلاتے ۔تو کب ننگا ہوا کہ ہم تجھے کپڑے پہناتے ۔تُو کب بیمار رہا کہ ہم تیری عیادت کرتے ۔ تب اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میرے کچھ بندے دنیا میں ایسے تھے جو بھوکے اور پیاسے اور ننگے اور بیمار تھے اورتم نے اُن کی خدمت کی ۔ پس گوتم نے میرے بندوں کے ساتھ یہ سلوک کیا مگر یہ ایسا ہی تھا کہ گویا تم نے مجھ سے یہ سلوک کیا ہے ۔

اِس مثال سے بھی ظاہر ہے کہ مخلوق کی محبت سے خالق کی محبت ملتی ہے ۔ اِسی لئے اللہ تعالیٰ سورہ آل عمران میں فرماتا ہے کہ وَ اللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ [۸۵] جب کوئی شخص محسن ہو جاتا ہے اور بنی نوع انسان سے حسن سلوک کرنے لگ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اُس سے محبت کرنے لگ جاتا ہے ۔ جب تم کسی سے محبت کرنے لگو تو بتاؤ کہ کیا تمہارا دل چاہتا ہے کہ تم تو اُس سے محبت کرو لیکن وہ تم سے محبت نہ کرے ۔ جب تم کسی سے محبت کرو گے تو لازماً تمہارا دل چاہے گا کہ وہ بھی تم سے محبت کرے لیکن دنیا میں تو یہ ہوسکتا ہے کہ تم زید سے محبت کرو اور زید تم سے محبت نہ کرے ۔تم ایک شخص کو چاہو اور وہ تمہیں نہ چاہے لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ خدا ایک بات چاہے اور وہ نہ ہو ۔ جب خدا کہتا ہے کہ جو شخص محسن ہو جاتا ہے میں اُس سے محبت کرتا ہوں تو یہ ناممکن ہے کہ تم محسن بنو اور خدا تم سے محبت نہ کرے اور اس کی محبت کے نتیجہ میں تمہارے دل میں بھی ضرور محبت پیدا ہوگی اور تم بھی اُس سے محبت کرنے لگ جاؤ گے ۔ یہ تو عام قاعدہ بھی ہے مگر خدا تعالیٰ کی تو یہ شان ہے کہ

اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ [۸۶]

(۴) گناہ پر ندامت کی عادت ڈالنا یعنی کوئی گناہ ایسا نہ ہو جس کے

بعد ندامت نہ ہو۔ اِس سے بھی محبت الٰہی پیدا ہوتی ہے کیونکہ جو شخص گناہ پر نادم ہو اُس کے اندر آہستہ آہستہ حسن کے دیکھنے اور قدر کرنے کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ جو شخص گناہ کرتا ہے اور پھر اُس کے اندر ندامت پیدا نہیں ہوتی اِس کے معنی یہ ہیں کہ اُس نے بُری تصویر دیکھی مگر اُس نے سمجھا ہی نہیں کہ یہ بُری تصویر ہے اور جس میں ندامت پیدا ہوتی ہے اُس کے متعلق ماننا پڑے گا کہ اُس میں یہ احساس ہے کہ وہ بُری چیزوں کو بُری سمجھتا ہے اور جب وہ بُری چیزوں کو بُری سمجھے گا تو لازماً اچھی چیز دیکھ کر اُسے اچھی سمجھے گا۔ جب یہ مادّہ کسی شخص کے اندر پیدا ہو جائے اور وہ حسن کو دیکھنے لگے تو پھر خدا تعالیٰ کی محبت کا دروازہ آپ ہی کھل جاتا ہے کیونکہ وہ سب سے بڑا محسن اور سب سے بڑا حسین ہے۔ اِسی لئے فرماتا ہے اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ [۸۷] اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

(۵) جو انسان اپنے دل میں یہ یقین پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہے کہ دعا کے بغیر میرے کام نہیں ہو سکتے۔ اُس کے دل میں بھی اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص اِس خیال کو اپنے دل میں مرکوز کر لے گا وہ لازماً دعاؤں کی طرف زیادہ توجہ کرے گا۔ کہے گا فلاں کا کام دعا سے ہوا ہے آؤ میں بھی اُس سے دعا کروں اور اس طرح خدا تعالیٰ کا احسان اُس کے زیادہ قریب آ جائے گا۔ یوں تو خدا تعالیٰ نے ہی سورج اور چاند اور ستارے اور ہوا اور دوسری ہزاروں ہزار چیزیں پیدا کی ہیں اور انسان جانتا ہے کہ یہ سب خدا تعالیٰ کی عطا کردہ ہیں لیکن جب یہ بات نظر کے سامنے آئے کہ میں نے فلاں چیز مانگی اور خدا

نے دے دی۔ میں نے فلاں چیز مانگی اور خدا نے دے دی تو جو اثر یہ چیزیں پیدا کرتی ہیں وہ سورج اور چاند اور ستارے پیدا نہیں کرتے۔ پس دعا کی طرف توجہ کرنا بھی محبت الٰہی پیدا کرتا ہے۔ بے شک شروع میں تکلّف والا حصہ آئے گا لیکن جب یہ بار بار دعائیں مانگے گا تو لازماً اس کی دعائیں قبول بھی ہوں گی اور بعض دفعہ معجزانہ رنگ میں قبول ہوں گی اور اس کی وجہ سے احسان جس سے محبت پیدا ہوتی ہے ننگا ہو کر اس کے سامنے آ جائے گا اور اس کے دل میں بھی محبت الٰہی پیدا ہو جائے گی۔ اِس کی طرف بھی اوپر کی آیت اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ کے دوسرے معنوں نے اشارہ کیا ہے۔

تَوَّابِیْنَ کے دو معنی ہیں۔ایک توبہ کرنے والوں کے اور دوسرے تَوَّاب اُس شخص کو کہتے ہیں جو بار بار اُس کی درگاہ میں جاتا ہے۔ پس جو شخص بار بار اُس کی درگاہ میں جاتا ہے اُس کے دل میں بھی خدا تعالیٰ کی محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر یہ بات بھی فطرتِ انسانی میں داخل ہے کہ جب انسان مانگتا ہے تو عجز کرتا ہے اور جب عجز کرتا ہے تو اُس کے دل میں محبت پیدا ہوتی ہے۔ اِس طرح بھی توّاب خدا تعالیٰ کی محبت کا جاذب بن جاتا ہے۔

(۶) جو شخص خدا تعالیٰ پر اپنے کاموں کو چھوڑ دے یعنی تدبیریں سب کرے لیکن یہ یقین کرے کہ نتیجہ اللہ تعالیٰ ہی نے نکالنا ہے اُس کے دل میں بھی اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ جو شخص اپنے کام کو اُس پر چھوڑتا ہے وہ کم سے کم تکلّف سے اُس کی طاقتوں اور اُس کے احسان کا اقرار کرتا ہے اور یہ تکلّف آخر حقیقت بن جاتا ہے جیسا کہ اکثر دنیا کے کاموں میں ہوتا ہے اِسی کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا

گیا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ [۸۸] جو شخص خدا تعالیٰ پر اپنے کام چھوڑ دیتا ہے اور کہتا ہے یہ مجھ سے نہیں ہو سکتے آپ ہی یہ کام کیجئے اُس کے دل میں بھی اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہو جاتی ہے۔

(۷) جو شخص دنیا میں خدا تعالیٰ کے لئے انصاف کو قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے اُس کے دل میں بھی محبت الٰہی پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ انصاف کا ترک اپنے یا اپنے رشتہ داروں اور دوستوں اور عزیزوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔ انسان اِسی لئے انصاف چھوڑتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے اگر میں نے انصاف سے کام لیا تو میری ماں کو نقصان پہنچے گا یا میرے باپ کو نقصان پہنچے گا یا میرے رشتہ داروں کو نقصان پہنچے گا۔ پس انصاف کے ترک کی ایک بڑی وجہ اپنی یا اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کی محبت ہوتی ہے اور یا پھر انصاف کا ترک دشمن کے بُغض کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یہی دو وجوہ ناانصافی کے ہوا کرتے ہیں یعنی دونوں فریق میں سے ایک کی دوستی یا ایک کا بُغض۔ ظاہر ہے کہ جو نہ اپنی یا اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کی محبت کی پرواہ کرے گا نہ دشمن کا بُغض اُسے انصاف سے پھیرے گا کوئی اُس محبت سے بڑی محبت یا اُس بُغض سے بڑا خوف ضرور اُس کے دل میں ہوگا۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ اگر فلاں مقدمہ کا میں یوں فیصلہ کر دوں تو میرے بچہ کو فائدہ ہوگا یا میرے دوست کو فائدہ ہوگا یا ماں باپ کو فائدہ ہوگا مگر اس کے باوجود وہ نہیں کرتا تو اِس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی اور بڑی محبت اُس کے پیچھے ہے اِس لئے وہ انصاف کو ترک نہیں کرتا یا اگر کوئی بڑا دشمن اس کے قابو آ گیا ہے مگر باوجود اس کے کہ یہ اُس سے بدلہ لے سکتا ہے پھر بھی یہ انصاف سے کام لیتا ہے اور دشمنی کی پرواہ نہیں کرتا تو صاف ظاہر ہے

کہ اُس بُغض کا بدلہ لینے کے پیچھے کوئی ڈر اور خوف ہے جو اُسے ترکِ انصاف سے روکتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ اگر میں نے بدلہ لیا تو میرے لئے اچھا نہیں ہوگا۔ یہ بڑی محبت یا بڑا خوف اللہ تعالیٰ کا ہی ہوسکتا ہے جو خواہ معین طور پر اللہ کے نام سے ہو یا غیر معین کسی بالا اور اعلیٰ طاقت کی وجہ سے ہو۔ بہر حال اُس کی فطرت میں محبت یا خوف پایا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ انصاف سے کام لیتا ہے اور یہ محبت یا خوف اللہ تعالیٰ کا ہی ہوسکتا ہے۔ اور جس کے دل میں یہ بات نہیں لازماً اُس کا یہ فعل اِس لئے ہوگا کہ گویا وہ کسی بڑی طاقت کو مانتا ہے یا اُس کے قریب ہونا چاہتا ہے اور جب ایسا مقام کسی کو حاصل ہو جائے تو لازماً وہ خدا تعالیٰ سے محبت کرنے لگ جائے گا اور جب وہ خدا تعالیٰ سے محبت کرے گا تو خدا بھی اُس سے محبت کرنا شروع کر دے گا۔ چنانچہ اِس بارہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ[۸۹] اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

(۸) ایک طریقہ محبت الٰہی کے حصول کا یہ ہوتا ہے کہ انسان ہر امر میں خدا تعالیٰ کو ڈھال بنانے کی کوشش کرے۔ یعنی بدی کو خدا کے لئے چھوڑے بدی کو بدی کے لئے نہ چھوڑے۔ یہی وہ چیز ہے جسے تقویٰ کہتے ہیں۔ جب انسان کو کسی ہستی کی خاطر کام کرنے کی عادت ہو جاتی ہے تو آہستہ آہستہ اُس سے محبت ہو جاتی ہے۔ چنانچہ بادشاہوں، نوابوں اور رؤساء سے پُرانے خاندانی خدام اور رعایا کی محبت اِسی لئے ہوتی ہے کہ اُنہیں اُن کی خاطر کام کرنے کی عادت ہوتی ہے اور اس عادت کی وجہ سے اُن کی محبت ترقی کرتی رہتی ہے۔ اِسی طرح انسان کو چاہیے کہ وہ جو کام بھی کرے خدا تعالیٰ کی رضا کے لئے کرے۔ مثلاً اگر وہ صدقہ دیتا ہے تو کہے

کہ میں یہ صدقہ اس لئے نہیں دیتا کہ میری نیک نامی اور شہرت ہو بلکہ اِس لئے دیتا ہوں کہ خدا نے صدقہ دینے کا حکم دیا ہے یا فلاں پر میں ظلم نہیں کروں گا کیونکہ میں خدا سے ڈرتا ہوں ۔ جب اِس طرح اُسے ہر کام میں اللہ تعالیٰ کا نام لینے کی عادت پڑ جائے گی تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اُس کی وابستگی ہو جائے گی ۔ اِسی کی طرف اللہ تعالیٰ اِس آیت میں اشارہ فرماتا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ[۹۰] جو بُرے کاموں سے میرے لئے بچتے ہیں اور جو نیکی کا کام میرے لئے کرتے ہیں اُن سے میں محبت کرتا ہوں اور اسی کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہدایت دیتے ہیں کہ تم میں سے جب کوئی شخص نیک کام کرے تو اُسے چاہیے کہ وہ اِحْتِسَابًا کرے ۔[۹۱] اِحْتِسَابًا کے معنی ہیں خدا تعالیٰ کی خوشنودی اور اُس کی جزاء کے لئے ۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ مقام ادنیٰ ہے حالانکہ یہ بہت اعلیٰ مقام ہے اور اِس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے محبت کرنے لگ جاتا ہے ۔

(۹) محبت کا ایک ذریعہ ہم جنس بننا ہے ۔ جتنا جتنا کوئی ہم جنس بنے اِس کی محبت اُسے اور اُس کی اِسے پیدا ہو جاتی ہے ۔ انسانوں کو دیکھ لو سب ہم جنس سے محبت کرنے کے عادی ہیں مُلکی مُلکیوں سے اور ایک زبان والے اپنی زبان والوں سے اسی وجہ سے محبت کرتے ہیں کہ وہ اُن کے ہم جنس ہوتے ہیں بلکہ انسان تو الگ رہے جانوروں میں بھی یہ بات پائی جاتی ہے ۔ کوّے سب اکٹھے رہیں گے ، قاز[۹۲] سب اکٹھے رہیں گے ، مرغ ، گھوڑے اور گدھے اپنی اپنی جنس میں رہیں گے ۔ ایک طرف آدمی ہوں اور دوسری طرف گھوڑے اور تم کسی گھوڑے کو کھلا چھوڑ دو تو وہ فوراً گھوڑوں کی طرف چلا جائے گا ۔ اِسی کی طرف خدا تعالیٰ قرآن شریف میں

اِن الفاظ میں اشارہ فرماتا ہے کہ یُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ خدا تعالیٰ اُن لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اُس کے ہم جنس بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ پس خدا تعالیٰ کی جو صفات قرآن کریم میں بیان ہوئی ہیں تم اُن کی نقل کرنے کی کوشش کرو۔ تم حیّ نہیں بن سکتے لیکن تم بیمار کا علاج کر کے یا بیمار کی خدمت کر کے حیّ کی نقل تو کر سکتے ہو۔ تم ممیت نہیں بن سکتے لیکن تم بدی کا خاتمہ کر کے ممیت کی نقل تو کر سکتے ہو۔ تم خالق نہیں بن سکتے لیکن تم اچھی اولاد پیدا کر کے خالق کی نقل تو کر سکتے ہو۔ مُتَطَهِّر کے معنی ہیں تکلّف کے ساتھ پاکیزگی اختیار کرنا۔ پس اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ میں اللہ تعالیٰ نے اِس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اگر تم میری نقلیں کرنی شروع کر دو تو میں تم سے محبت کرنے لگ جاؤں گا۔ پس صفاتِ الٰہیہ کو جو شخص اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے جس جس قدر اللہ تعالیٰ سے اُسے مشابہت ہوتی جاتی ہے اُس کے دل میں خدا تعالیٰ کی محبت پیدا ہوتی جاتی ہے اور خدا تعالیٰ کو اُس کی محبت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ تم اپنے اپنے دائرہ میں چھوٹے خدا بننے کی کوشش کرو۔ جب تم چھوٹے خدا بن جاؤ گے تو بڑا خدا تم سے آپ ہی محبت کرنے لگ جائے گا۔

(۱۰) ایک ذریعہ محبت کا فطرت کا مطالعہ اور محبت کے طریقوں پر غور کرنا اور اُن پر عمل کرنا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا [۹۳] اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر کچھ جذبات رکھے ہیں جو خود اُس نے پیدا کئے ہیں۔ اِن میں صفاتِ الٰہیہ کی جھلک رکھی گئی ہے یعنی انسان کے

اندر اُس نے ایسے مادے رکھ دئے ہیں جن سے خدا اور بندے میں ہم جنسیت ہو جاتی ہے۔

اب ہم قانونِ قدرت سے وہ امور تلاش کرتے ہیں جو محبت پیدا کرنے کا ذریعہ ہوتے ہیں تا کہ ان پر غور کر کے ایک طالبِ صادق محبت الٰہی پیدا کر سکے۔

(ا) سب سے پہلی محبت ہم دیکھتے ہیں کہ ماں باپ اور اولاد کی ہوتی ہے اِس محبت میں حسن اور احسان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ کسی ماں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ میں اپنے بچہ سے اِس لئے محبت نہیں کرتی کہ وہ خوبصورت نہیں۔ نہ کوئی ماں یہ کہتی ہے کہ میں اپنے بچوں سے اس لئے محبت کرتی ہوں کہ اُنہوں نے ہم پر احسان کئے ہوئے ہیں۔ نہ بچے نے ماں باپ پر احسان کئے ہوتے ہیں اور نہ وہ اُس کی شکل دیکھتے ہیں بلکہ باوجود بدصورت ہونے کے اُنہیں اپنا بچہ ہی سب سے زیادہ خوبصورت نظر آتا ہے۔ آج ہی ایک عورت مجھ سے ملنے کے لئے آئی اُس نے گود میں اپنا بچہ اُٹھایا ہوا تھا۔ اُس بچہ کو دیکھ کر گھن آتی تھی۔ ناک بہہ رہا تھا اور بہتے ہوئے اُس کے ہونٹوں پر گر رہا تھا مگر ماں کو اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی اور وہ اُس کی رینٹھ کو غالباً مشک اور عنبر سے بھی زیادہ اچھا سمجھتی تھی تو ماں باپ کی محبت کسی ظاہری دلیل کی وجہ سے نہیں ہوتی۔

کتابوں میں قصہ لکھا ہے کہ ایک بادشاہ اپنے دربار میں بیٹھا ہوا تھا کہ اُس نے ایک حبشی کو بُلایا اور اُسے ایک خوبصورت ٹوپی دے کر کہا کہ تمہیں اِس دربار میں جو سب سے زیادہ خوبصورت بچہ دکھائی دے اُس کے سر پر جا کر یہ ٹوپی رکھ دو۔ وہ سیدھا اپنے بیٹے کی طرف گیا جو نہایت کالا کلوٹا اور بھدی شکل کا تھا اور جس کے

موٹے موٹے ہونٹ تھے ناک بیٹھا ہوا تھا اور ٹوپی اُس کے سر پر رکھ دی۔ یہ دیکھ کر سارا دربار ہنس پڑا۔ بادشاہ نے اُس سے کہا کہ میں نے تو تمہیں کہا تھا کہ سب سے خوبصورت بچہ کے سر پر یہ ٹوپی جا کر رکھ دو اور تم نے اِس بچہ کے سر پر رکھ دی۔ اُس نے کہا بادشاہ سلامت مجھے تو یہی بچہ سب سے زیادہ خوبصورت نظر آتا ہے۔ تو ماں باپ کی اپنے بچوں سے محبت اُن کی اچھی شکل وصورت کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ بعض اور چیزوں کی وجہ سے ہوتی ہے جن کو میں آگے چل کر بیان کروں گا اور جن کو ماں باپ بھی نہیں جانتے۔ چنانچہ کسی ماں سے پوچھ کر دیکھ لو کہ تم اپنے بچے سے کیوں محبت کرتی ہو تو بجائے جواب دینے کے وہ ہنس کے کہہ دے گی کہ سودائی کہیں کا یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے حالانکہ بچہ ماں باپ کے لئے موجب تکلیف اور خرچ ہوتا ہے۔ بچہ پیدا ہوتے ہی اُس کی رات دن نگرانی کرنی پڑتی ہے۔ دایہ کے اخراجات برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ سردی اور گرمی کے اثرات سے محفوظ رکھنے کے لئے کپڑے تیار کرنے پڑتے ہیں۔ پھر اگر بچہ کو رات کے وقت پیٹ میں کوئی تکلیف ہو جائے تو ماں ساری ساری رات اُسے لے کر پھرتی رہتی ہے اور جب وہ درد کی وجہ سے روتا اور چلاتا ہے تو وہ کہتی ہے ’’میں مَر جاؤں‘‘، ’’میں مَر جاؤں‘‘۔ پس ماں باپ سے پوچھنے کی بجائے ہمیں فلسفیانہ طور پر غور کرنا چاہیے کہ آخر بچہ سے ماں باپ کیوں محبت کرتے ہیں۔ اِس نقطۂ نگاہ سے جب ہم غور کرتے ہیں تو ہمیں اس محبت کی پانچ وجوہ معلوم ہوتی ہیں۔

پہلی وجہ اِس محبت کی مقامِ خالقیت ہے۔ یعنی ماں باپ اپنے بچوں سے اِس لئے محبت کرتے ہیں کہ وہ ایک رنگ میں اُن کے خالق ہوتے ہیں اور وہ

دنیا میں ایک نیا وجود پیدا کرتے ہیں۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا اس لئے بنائی ہے کہ یہ ترقی کرے اور پھیلے اور چونکہ پیدائش عالَم کی ایک بڑی غرض یہ تھی جیسا کہ وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَّنِسَآءً [۹۴] سے ظاہر ہے اور پتہ لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا اِس لئے نہیں بنائی تھی کہ صرف آدم وحوا پیدا ہوجائیں بلکہ وہ چاہتا تھا کہ اُن کی نسل کو پھیلائے اور ترقی دے اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے بہر حال اِس سلسلہ کو جاری رکھنا تھا اِس لئے اُس نے ماں باپ کے دل میں اپنے بچوں کی محبت پیدا کر دی۔ پس ماں باپ کی محبت کی ایک بڑی وجہ خالقیت ہے اور جب ہمیں یہ معلوم ہو گیا تو اِس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ جب خدا کہتا ہے کہ میں سب سے زیادہ محبت رکھتا ہوں تو ہمیں یہ بات مان لینی چاہیے۔ جب انسان خالقیت کے ایک ادنیٰ پرتَو کی وجہ سے اپنے بچوں سے اتنی محبت رکھتا ہے تو اصل خالق کو اپنی مخلوق سے جس قدر محبت ہوسکتی ہے اُس کا تو اندازہ لگانا بھی انسانی طاقت اور قوت سے باہر ہے۔

(۲) ماں باپ کی محبت کی دوسری وجہ وحدتِ جسمانی ہے۔ انسان کی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے یہ مادہ رکھا ہے کہ وہ بغیر سوچے سمجھے اپنے جسم کو بچانے کی کوشش کرتا ہے تم اچانک اپنے کسی دوست کی آنکھ کی طرف زور سے انگلی لے جاؤ تو وہ فوراً اپنی آنکھ جھپک لے گا کیونکہ یہ فطرتی چیز ہے اور اِس میں سوچنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ پچھلے دنوں میری ایک نواسی جو ابھی چھوٹی بچی ہی ہے اور اُس کا والد سیّد ہے میرے پاس آئی اور میں نے مذاق کے طور پر اپنی سوٹی اُس کی طرف اِس انداز میں کی کہ گویا ابھی میں اُسے مارنے لگا ہوں۔ میری سوٹی کے آگے نوکدار

پھل بھی لگا ہوا ہے چونکہ میں نے اچانک ایسا کیا تھا اِس لئے اُس نے ڈر کر چیخ ماری۔تھوڑی دیر کے بعد جب وہ ٹھیک ہوگئی تو میں نے اُسے ہنس کر کہا سیّد بزدل ہوتے ہیں، مغل بہادر ہوتے ہیں۔ کہنے لگی نہیں نہیں سیّد بہادر ہوتے ہیں۔تھوڑی دیر کے بعد جب اُس کے ذہن سے یہ بات اُتر گئی تو میں نے پھر اُسے ڈرانے کے لئے اِسی طرح کیا اور وہ پھر ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔ میں نے کہا دیکھا سیّد ڈر جاتے ہیں۔خیر وہ چلی گئی اور چند دن مشق کرتی رہی۔ اِس کے بعد وہ پھر میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ اب دیکھیں میں ڈرتی ہوں یا نہیں؟ چنانچہ میں نے اُسے ڈرایا تو وہ نہیں ڈری لیکن دو چار دن کے بعد جب وہ پھر میرے پاس آئی تو غیر متوقع طور پر میں نے پھر اُسے ڈرا دیا اور میں نے دیکھا کہ اس دفعہ بھی وہ ڈر گئی کیونکہ وہ اِس کے لئے تیار نہیں تھی تو فطرت کے اندر خدا تعالیٰ نے اپنے جسم کی حفاظت کا مادہ رکھا ہے چونکہ بچہ ماں باپ کے جسم کا ایک حصہ ہوتا ہے اِس لئے اپنے جسم کو بچانے کا جو مادہ فطرت میں ہوتا ہے وہ اِدھر منتقل ہو جاتا ہے اور ماں باپ اپنے بچہ سے محبت کرنے لگتے ہیں۔

(۳) ماں باپ کی محبت کی تیسری وجہ اپنائیت ہوتی ہے جس طرح وحدتِ جسمانی ایک طبعی محبت پیدا کرتی ہے اِسی طرح تعلق کے لحاظ سے بھی ایک ہو جانے کا خیال محبت پیدا کر دیتا ہے۔تمہارا کوٹ پھٹ جائے تو تمہیں کوئی پرواہ نہیں ہوتی کیونکہ کوٹ کے ساتھ اپنائیت کا تعلق نہیں ہوتا۔تم سمجھتے ہو کہ ایک کوٹ پھٹا تو دوسرا لے لیں گے لیکن جہاں تمہارا تعلق ہوتا ہے وہاں اُس چیز کے ضائع ہونے سے تمہیں درد ہوتا ہے۔ پس وحدتِ جسمانی کی طرح اپنائیت بھی محبت پیدا کرتی ہے۔

خدا تعالیٰ نے اِس دنیا کا سلسلہ ایسا بنایا ہے کہ ہر بچہ اپنے ماں باپ کے پاس رہتا ہے اور ماں باپ اُس بچہ کو کوئی غیر چیز نہیں بلکہ اپنی چیز سمجھتے ہیں اِس لئے اُس سے محبت رکھتے ہیں۔ گورنمنٹ لوگوں پر ٹیکس لگا سکتی ہے لیکن اگر گورنمنٹ یہ چاہے کہ وہ کسی کا بچہ لے لے تو وہ بچہ نہیں لے سکتی۔ پس اپنائیت کی انتہاء بھی محبت پیدا کرتی ہے۔

(۴) بقائے ذات کی خواہش بھی محبت پیدا کرتی ہے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ انسان چاہتا ہے میں ہزار سال زندہ رہوں مگر ظاہر ہے کہ انسان اِس دنیا میں ہمیشہ کے لئے زندہ نہیں رہ سکتا۔ ۹۵ لیکن دوسری طرف بقائے ذات کی خواہش بھی ہر انسان میں پائی جاتی ہے جس کا ایک ہی ذریعہ ہوتا ہے کہ اُس کی اولاد اُس کے نام کو زندہ رکھتی ہے اور اِس طرح بقائے ذات کی خواہش ایک رنگ میں پوری ہو جاتی ہے۔ پس چونکہ انسان یہ سمجھتا ہے کہ میں دنیا میں اگر زندہ رہ سکتا ہوں تو بچہ کی طرف سے، اس لئے اُسے اپنے بچہ سے محبت ہوتی ہے۔

(۵) ماں باپ کی محبت کی پانچویں وجہ مظہریت ہوتی ہے۔ بقائے ذات کی خواہش تو یہ تھی کہ انسان چاہتا ہے میں خود زندہ رہوں اور مظہریت کے معنی یہ ہیں کہ انسان چاہتا ہے کہ جو چیزیں اُس سے ظاہر ہوتی ہیں وہ بھی ہمیشہ قائم رہیں۔ ایک شخص جوانی میں خوب چل پھر سکتا ہے، گھوڑے پر سواری کرتا ہے اور میلوں میل تک سفر کرتا چلا جاتا ہے اب جہاں طبعی طور پر اُس کے اندر یہ خواہش پائی جاتی ہے کہ میں ہمیشہ زندہ رہوں وہاں اس کے اندر یہ خواہش بھی پائی جاتی ہے کہ میں ہمیشہ جوان رہوں۔ یہ نہیں چاہتا کہ میں بُڈّھا ہو جاؤں اور لوگ میرے منہ میں لقمے ڈالا

کریں۔ گویا اُس کی خواہش ہوتی ہے کہ میری مظہریت دنیا میں قائم رہے اور چونکہ انسان کی مظہریت اُس کی اولاد کے ذریعہ ہی قائم رہ سکتی ہے اِس لئے فطرتی طور پر ہر شخص اپنے بچوں سے محبت رکھتا ہے۔

یہ پانچ چیزیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے بغیر سوچے سمجھے اور بغیر کسی دلیل کے ماں باپ اپنی اولاد سے محبت کرتے ہیں اور یہ ایسے گہرے موجبات ہیں کہ انسان کی فطرت میں مرکوز ہیں حتّٰی کہ اُسے اِن کے بارہ میں سوچنے کی بھی ضرورت نہیں جس طرح انسان کا اپنا جسم دماغ پر خود بخود اثر کرتا ہے یہ موجبات بھی اُس کے دماغ پر تصرف کرتے ہیں حتّٰی کہ وہ بغیر موجبات کو سوچنے کے مُوجَبْ کو محسوس کرنے لگتا ہے۔

شاید کوئی کہے کہ پہلی محبت تو بچہ کو ماں باپ کی ہوتی ہے آپ نے یہ کیوں کہا کہ پہلی محبت ماں باپ کو بچہ کی ہوتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انسانی نسل کو اگر اس اصول پر مانا جائے کہ آدم وحوا سے نسل انسانی چلنی شروع ہوئی تو ماننا پڑے گا کہ پہلی محسوس محبت آدم وحوا کو ہوئی کیونکہ آدمِ اوّل خواہ یکدم پیدا ہوا خواہ غیر محسوس دَور سے گذر کر محسوس دَور میں داخل ہوا۔ اُس نے ماں باپ کی محبت کو نہیں دیکھا یا نہیں سمجھا لیکن اُس نے اپنی اولاد کی محبت کو پہلی دفعہ دیکھا اور سمجھا اور یہی حق ہے۔ پس آدم وحوا کی پیدائش کی تھیوری کو دیکھا جائے تو ماننا پڑے گا کہ پہلی محبت ماں باپ کی بچہ سے تھی پہلی محبت بچہ کی ماں باپ سے نہیں تھی یا یوں کہو کہ پہلے اِس محبت کو محسوس کرنے والے ماں باپ تھے بچے نہیں تھے۔ یوں تو لوگ ہمیشہ بحث کیا کرتے ہیں کہ پہلے انڈا تھا یا مرغی؟ اور یہ بحث ہمیشہ جاری رہے گی کہ پہلے آدم ہوا

یا بچہ۔لیکن بہر حال کوئی نہ کوئی تھیوری ماننی پڑے گی ۔ڈارون کہتا ہے کہ نسل انسانی نے آہستہ آہستہ ارتقائی صورت اختیار کی ہے پہلے وہ بعض جانوروں کی شکل میں تھا لیکن ارتقائی دَور میں سے گزرتے گزرتے آخر وہ انسانی شکل میں نمودار ہوا۔ قرآن کریم اِس تھیوری کو غلط قرار دیتا ہے لیکن بہر حال اگر ڈارون کی تھیوری لو تب بھی پہلا وجود جو محسوس محبت کرنے والا تھا وہ ماں باپ کا ماننا پڑے گا بچے کا نہیں اور اگر قرآن کریم کی تھیوری لو تب بھی ماں باپ کی محبت کو پہلی محبت ماننا پڑے گا بچے کی محبت کو پہلی محبت نہیں ماننا پڑے گا۔ دینی لحاظ سے بھی یہی اصل ہے کیونکہ خالق و مخلوق کے تعلق میں خالقیت کا تعلق مقدم ہے اور مخلوقیت کا تعلق مَا بَعْد ۔پس ماننا پڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جب اپنی محبت کے لئے پیدا کیا تو پہلے محبت اللہ تعالیٰ کے دل میں آئی اور اس کے بعد مخلوق میں ۔جس طرح پہلے محبت ماں باپ کے دل میں آتی ہے اور بعد میں بچہ میں جب وہ محسوس کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ماں جنتے ہی بچہ سے محبت کرتی ہے بلکہ جننے سے بھی پہلے۔لیکن بچہ کی ماں ولادت کے وقت فوت ہو جائے تو وہ پالنے والی عورت ہی کو ماں سمجھنے لگتا ہے اور اصل ماں باپ کو بھول جاتا ہے۔

اِس سوال کا جواب دینے کے بعد اَب میں اُن موجبات کو لیتا ہوں جو ماں باپ کے دل میں محبت پیدا کرنے والے ہیں لیکن جن کو وہ خود نہیں جانتے صرف ان کے نتیجہ کو جانتے ہیں اور اُن کو انسان اور خدا تعالیٰ کے رشتہ پر چسپاں کرتے ہیں ۔

(الف) پہلا موجب میں نے خالقیت کا بتایا ہے یہ ہمیں فطرتِ انسانی سے معلوم ہوتا ہے۔ بچے گڑیاں بنانے کے شوقین ہوتے ہیں، مکان بنانے کے شوقین

ہوتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خالقیت کا ایک زبردست تقاضا انسان وحیوان میں ہے اور پھر وہ اپنی مخلوق سے طبعاً محبت کرتا ہے۔ پس یہ جذبہ سب سے پہلے ماں باپ کے دل میں بچہ کی محبت پیدا کرتا ہے اور اس سے ہم یہ نتیجہ بھی نکال سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جو اصل خالق ہے اُس کی محبت اپنی مخلوق سے بہت زیادہ شدید ہونی چاہیے اور سچ پوچھو تو اس کی موٹی مثال موجود ہے۔ ماں باپ کے جتنے قصور بچے کرتے ہیں وہ کب تک اُن کو معاف کرتے ہیں۔ بعض دفعہ تو ایک بات نہ ماننے پر ہی اُنہیں عاق کر دیتے ہیں۔ بیسیوں واقعات سننے میں آتے ہیں کہ ماں باپ نے اپنے بچوں کو عاق کر دیا اور جب پوچھا گیا کہ آپ نے عاق کیوں کیا ہے تو اُنہوں نے جواب یہ دیا کہ ہم نے کہا تھا فلاں جگہ شادی کرلو مگر اُس نے ہماری بات نہ مانی اور فلاں جگہ شادی کر لی۔ اب کوئی اُن سے پوچھے کہ یہ بھی کوئی عاق کرنے والی بات تھی۔ عمر اُس نے بسر کرنی تھی یا تم نے؟ مگر وہ برداشت نہیں کر سکتے اور اُنہیں عاق کر دیتے ہیں۔ اِس کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کا یہ حال ہے کہ رات دن دنیا کی چھاتی پر انسان گناہ کر رہا ہے اور خدا تعالیٰ کی بات کو ردّ کر رہا ہے مگر وہ ہے کہ اوّل تو عذاب نہیں دیتا اور پھر باوجود جاننے کے کہ کل یہی شخص توبہ توڑ دے گا اُس کی توبہ کو قبول کر لیتا ہے اور فرماتا ہے اگر کل اِس نے توبہ توڑی تو دیکھا جائے گا آج تو یہ توبہ کر رہا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے **وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى**[۹۶] اگر اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو جو ظلم اور گناہ کرتے ہیں پکڑنا چاہے تو انسان کیا حیوان بھی اِس دنیا کے پردہ پر نہ رہیں اور انسان کا نام ونشان تک مٹا دیا جائے مگر وہ ٹلاتا جاتا ہے اور کہتا ہے معاف کر

دو۔ کیا دنیا میں کوئی ماں باپ ہیں جو اپنے بچوں کو اتنا معاف کرتے ہوں۔ اپنے نفس پر غور کر کے دیکھ لو ہم میں سے ہر شخص خدا کی جس قدر نافرمانیاں کرتا ہے اور جس قدر ہزاروں ہزار قصور اُس سے سرزد ہوتے ہیں کیا اِس قدر نافرمانیاں وہ اپنے ماں باپ کی کر سکتے ہیں؟ وہ تو مار مار کر دھجیاں اُڑا دیں۔

(ب) دوسری وجہ ماں باپ کی محبت کی میں نے وحدتِ وجود بتائی ہے خدا تعالیٰ کو انسان سے یہ تعلق تو نہیں لیکن وحدتِ مرکزیت کا تعلق ہے کیونکہ انسان اپنی ساری طاقتیں اُس سے لیتا ہے۔ ماں باپ چھوٹے قد کے ہوں تو بچہ بعض دفعہ لمبے قد کا ہوتا ہے۔ ماں باپ کی نظر کمزور ہو تو بچے کی نظر تیز ہوتی ہے۔ ماں باپ کُند ذہن ہوں تو بچہ بعض دفعہ بڑا ذہین ہوتا ہے۔ یا ماں باپ بہادر ہوں تو بچہ بُزدل ہوتا ہے۔ غرض ہزاروں ہزار چیزیں ایسی ہیں کہ باوجود وحدتِ وجود کے بچے ماں باپ سے نہیں لیتے لیکن خدا تعالیٰ کو انسان سے چونکہ وحدتِ مرکزیت کا تعلق ہے اور انسان کُلّی طور پر اپنی طاقتیں اُسی سے لیتا ہے اِس لئے کوئی چیز ایسی نہیں جو انسان کو خدا سے حاصل نہ ہو گویا خدا تعالیٰ اِنجن ہے اور وہ کَل اور یہ تعلق بھی بڑا گہرا ہوتا ہے۔

(ج) تیسری وجہ ماں باپ کی محبت کی اپنائیت ہے کہ یہ شَے میری ہے۔ یہ تعلق بھی اللہ تعالیٰ کا اِنسان سے ماں باپ سے زیادہ ہے کیونکہ ان کا اپنائیت کا احساس ابتداء کے لحاظ سے بھی محدود ہے اور انتہاء کے لحاظ سے بھی محدود ہے۔ ماں باپ کی اپنائیت کا احساس اُس وقت ہوتا ہے جب بچہ رحمِ مادر میں آتا ہے اور جب وہ مَر جاتا ہے تو یہ احساس ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا یہ احساس یا تعلق دونوں

لحاظ سے غیر محدود ہے۔ میں خواہ آج پیدا ہوا یا پچھلی صدی میں پیدا ہوا۔ خدا تعالیٰ ازل سے یہ جانتا تھا کہ میں اُس کا ہوں اور ازل سے یہ جانتا ہے کہ میں مَرنے کے بعد بھی اُسی کا ہوں پس ماں باپ کی اپنائیت محدود دائرہ کے لئے ہے اور خدا تعالیٰ کی اپنائیت غیر محدود دائرہ کے لئے ہے۔

(د) چوتھی وجہ ماں باپ کی محبت کی بقائے ذات کا احساس ہے چونکہ اُنہوں نے فنا ہونا ہے اس لئے وہ ایک ایسے وجود کو چاہتے ہیں جن میں اُن کا وجود زندہ رہے۔ خدا تعالیٰ فنا سے پاک ہے مگر اس کا تعلق اس جہت سے بھی انسان سے ہے۔ ماں باپ کا بقائے ذات کا تعلق زمانہ کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ یعنی ماں باپ کو یہ احساس ہوتا ہے کہ جب ہم مَر جائیں گے تو اُس زمانہ میں یہ بچہ ہمارا قائم مقام ہوگا لیکن خدا تعالیٰ کا بقائے ذات کا تعلق مقام کے لحاظ سے ہے یعنی چونکہ وہ وراء الوراء ہے وہ انسان کے ذریعہ سے اپنے وجود کو دنیا میں زندہ رکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں صرف اپنے بندے کے ذریعہ دنیا میں ظاہر ہوسکتا ہوں اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام دنیا میں نہ آئے ہوتے تو اُن کی قوم خدا تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام دنیا میں نہ آئے ہوتے تو اُن کی قوم خدا تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں نہ آئے ہوتے تو اُن کی قوم خدا تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اِسی طرح بڑے بڑے اولیاء جو اُمتِ محمدیہ میں آئے اگر وہ نہ آئے ہوتے تو اُس زمانہ کے لوگ خدا تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اِسی طرح اِس زمانہ میں اگر حضرت مسیح موعود علیہ السلام نہ آتے تو دنیا خدا تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتی تھی۔ پس ماں باپ کو مدنظر رکھتے ہوئے بقائے ذات کا تعلق وقت کے لحاظ سے ہے اور

خدا تعالیٰ کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا بقائے ذات کا مقام کے لحاظ سے ہے۔ خدا اِس مجلس میں اِن آنکھوں سے نظر نہیں آ رہا لیکن اُس کے بندے نظر آ رہے ہیں جو اُس کے وجود کو دنیا میں زندہ رکھے ہوئے ہیں اور درحقیقت یہی قسم بقائے ذات کی اصل بقاء ہے۔ وہ بقاء ایک شکی سی چیز ہے اور یہ بقاء ایک یقینی اور قطعی چیز ہے۔ آخر سوچنا چاہیے کہ جسمانی بیٹا ماں باپ کی بقاء کا کس طرح موجب بنتا ہے۔ وہ صرف ورثہ لیتا ہے اِس کے سوا والدین کی حیات کا وہ اَور کیا موجب ہوتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے نیک بندے خدا تعالیٰ کے وجود کو دنیا میں زندہ کرتے اور زندہ رکھتے ہیں اور جسمانی بیٹوں کے مقابلہ میں خدا تعالیٰ سے اُن کی محبت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ چنانچہ دیکھ لو بقائے ذات کی خواہش رکھنے والے ماں باپ کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ بعض دفعہ محتاج بھی ہوتے ہیں تو بچہ اُن کی مدد نہیں کرتا۔ وہ اپنے ماں باپ کا وفادار ہونے کی بجائے اپنی اولاد کا زیادہ وفادار ہوتا ہے لیکن وفادار روحانی بیٹے کی یہ حالت ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ نے ابراہیمؑ کو خواب میں دکھایا کہ وہ اپنے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں تو ابراہیمؑ جو اپنی اولاد کے ذریعہ جسمانی بقاء کا محتاج تھا وہ اِس خواب کے آتے ہی اپنے بیٹے کو قربان کرنے کے لئے تیار ہو گیا اور اُس نے کہا جب میرا خدا مجھ سے یہ قربانی چاہتا ہے تو میں اپنا قدم پیچھے کیوں ہٹاؤں۔ پس وفادار جسمانی بیٹے اور وفادار روحانی بیٹے میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ جس طرح ابراہیم خدا نما تھا کوئی بیٹا بھی باپ نما نہیں ہوسکتا۔

(ھ) پانچویں وجہ یہ ہوتی ہے کہ انسان اپنے لئے علاوہ جسمانی حیات کے روحانی حیات بھی چاہتا ہے۔ سب سے زیادہ موقع تربیت کا اُسے اپنی اولاد کے

متعلق ملتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ میرے اخلاق کا مظاہرہ ہوتا رہے چنانچہ دیکھ لو والدین ہمیشہ یہ خواہش ظاہر کرتے ہیں کہ ہماری فلاں فلاں خوبیاں ہماری اولاد ظاہر کرے یا ہمارے فلاں مطمح نظر اُس کے ذریعہ سے پورے ہوں لیکن عملاً کم ہوتا ہے۔ پھر بھی ایسی خواہش کے پورا ہونے کا وجود اولاد ہی ہوسکتی ہے اِس لئے وہ اُن سے محبت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا بھی انسان اِس رنگ میں مظہر ہوتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرماتا ہے إِنَّآ أَرۡسَلۡنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيۡرًا ۝ لِّتُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَتُعَزِّرُوۡهُ وَتُوَقِّرُوۡهُ وَتُسَبِّحُوۡهُ بُكۡرَةً وَّأَصِيۡلًا إِنَّ الَّذِيۡنَ يُبَايِعُوۡنَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُوۡنَ اللّٰهَ يَدُ اللّٰهِ فَوۡقَ أَيۡدِيۡهِمۡ [۹۷] اِس آیت میں بتایا گیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے لئے بطور گواہ ہیں اور گواہ کے ذریعہ ہمیشہ فریق مقدمہ کی سچائی ظاہر ہوتی ہے۔ پس آپ کو گواہ قرار دینے کے معنی یہ ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود سے خدا تعالیٰ کی سچائی ثابت ہوتی ہے اور آپؐ کی ذات سے خدا تعالیٰ کا وجود ثابت ہوتا ہے اِس لئے آپؐ کی بیعت خدا کی بیعت ہے۔ پھر فرماتا ہے یہی نہیں بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ بھی خدا کا ہاتھ ہے اِس لئے کہ یہ ہاتھ مجھے دکھا رہا ہے اور چونکہ یہ میرا چہرہ دکھا رہا ہے اِس لئے اُس کا ہاتھ میرا ہاتھ ہے۔ گویا پہلی آیت يَدُ اللّٰهِ فَوۡقَ أَيۡدِيۡهِمۡ کی دلیل کے طور پر بیان کی گئی ہے یعنی چونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کے مظہر کامل ہیں اور آپؐ کے ذریعہ خدا تعالیٰ کا وجود اِس دنیا میں ظاہر ہو رہا ہے اِس لئے آپؐ کی بیعت خدا کی بیعت اور آپؐ کا ہاتھ خدا کا ہاتھ ہے۔ اِسی طرح اعلیٰ مومنوں کی نسبت فرماتا ہے کہ میں

اُن کے ہاتھ ہو جاتا ہوں، پاؤں ہو جاتا ہوں، زبان ہو جاتا ہوں یعنی وہ میری صفات کو دنیا میں ظاہر کرنے والے ہوتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اولاد سے جن امور کی بناء پر محبت کی جاتی ہے وہ سب کے سب خدا تعالیٰ میں پائے جاتے ہیں اِس لئے وہ لازماً اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے۔ بعض سے عام جیسا کہ ہر ماں باپ اپنے ہر قسم کے بچے سے پیار کرتے ہیں اور بعض سے خاص۔ جیسا کہ ماں باپ اُن بچوں سے جن میں زیادہ اوصاف جمع ہو جائیں دوسرے بچوں سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔

یہ ایک ضمنی حصہ ہے اور درحقیقت الگ باب ہے اس امر کے متعلق کہ خدا تعالیٰ کو اپنے بندوں سے کیوں اور کس قسم کی محبت ہوتی ہے مگر چونکہ میں محبت کا فلسفہ بیان کر رہا تھا یہ بھی درمیان میں آ گیا۔

(۲) دوسرا موجب محبت کا احسان ہوتا ہے اِس جذبہ کے ماتحت بچہ ماں باپ سے محبت کرتا ہے (ماں باپ کی محبت اِس کے برخلاف فطرتی ہوتی ہے جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے) کیونکہ ماں باپ اُس کے اخراجات برداشت کرتے اور اُس کے لئے ہر رنگ میں اپنے نفس پر تکالیف وارد کرتے ہیں۔ شاگرد اُستاد سے محبت کرتا ہے کیونکہ وہ اُسے سکھاتا اور تعلیم دیتا ہے۔ محتاج محسن سے محبت کرتا ہے کیونکہ وہ اُس کی ضرورت کو پورا کرنے والا ہوتا ہے۔ مرید شیخ سے محبت کرتا ہے کیونکہ وہ اُسے روحانی تعلیم دیتا ہے۔ یہ وجہ بھی اللہ تعالیٰ میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہے اور قرآن کریم نے اِس وجہ کی طرف خاص طور پر توجہ بھی دلائی ہے چنانچہ قرآن کریم میں بار بار اس امر کا ذکر کیا گیا ہے کہ اللہ رَبّ ہے، رحمٰن ہے، رحیم ہے، مٰلِكِ يَوْمِ

الدِّیۡنِ ہے، غفور ہے، ستّار ہے، جبار ہے، وارث ہے، حفیظ ہے، بصیر ہے، رزّاق ہے، سمیع ہے، مجیب الدعا ہے۔ یہ صفات بتا کر اللہ تعالیٰ نے توجہ دلائی ہے کہ تم اِن صفاتِ الٰہیہ پر غور کرو اور سوچو کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر کس قدر احسانات کئے ہیں اور یہ تو صرف چند نام بطور مثال میں نے لئے ہیں ورنہ بہت سے نام اللہ تعالیٰ نے بتائے ہیں جو اُس کی صفاتِ حسنہ پر دلالت کرتے ہیں فرق صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ نظر نہیں آتا اور ماں باپ، استاد، محسن اور پیر کا ہاتھ نظر آجاتا ہے۔ بندوں کے احسانات ظاہر ہوتے ہیں اور خدا تعالیٰ کے احسانات پوشیدہ ہوتے ہیں اور درحقیقت اِن احسانات کو پوشیدہ رکھنا ہی ضروری ہوتا ہے کیونکہ اس احسان مندی کا بڑا بدلہ مقرر ہے جو انسانوں کی احسان مندی کا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا بدلہ زیادہ ملتا ہے اور شیخ اور پیر کی محبت کا بدلہ اُتنا نہیں ملتا۔ جو چیز ظاہر ہو وہ چونکہ طبعی ہو جاتی ہے اور مزید بدلہ کا راستہ بند کر دیتی ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے احسانات کو مخفی رکھا ہے۔ اب یہ انسان کا کام ہے کہ وہ اُس کے احسانات کو تلاش کر کر کے اپنی محبت کو بڑھائے اور اُستوار کرلے۔

(۳) تیسری وجہ محبت کی حسن ہے۔ اِس کے مظہر میاں بیوی، عمدہ نظارے، عمدہ آواز، عمدہ قاعدے اور قانون وغیرہ ہوتے ہیں۔ یہ درجہ مادی محبت کے لحاظ سے احسان والی محبت سے ادنیٰ ہے۔ احسان والی محبت کا درجہ مادی لحاظ سے حسن والی محبت سے اعلیٰ ہے کیونکہ احسان والی محبت میں اخلاق کا دخل ہوتا ہے اور حسن کی محبت میں صرف طبعی میلانات بلکہ پس پردہ لذّاتِ جسمانی کا حصول اِس کا موجب ہوتا ہے۔ اِسی وجہ سے ماں باپ کی محبت بیوی کی محبت سے زیادہ اعلیٰ سمجھی

جاتی ہے کیونکہ اوّل الذکر کی بنیاد اخلاق پر اور ثانی الذکر کی لذاتِ جسمانی پر ہوتی ہے۔لیکن روحانی محبتوں میں یہ بات اُلٹ جاتی ہے مثلاً خدا تعالیٰ کی محبت کا موجب احسان کی یاد ہوتو یہ محبت درجہ کے لحاظ سے ادنیٰ سمجھی جائے گی لیکن حسن باری محبت کا موجب ہوتو یہ محبت اعلیٰ سمجھی جائے گی گویا دنیا کی محبتوں اور خدا تعالیٰ کی محبت میں یہ فرق ہے کہ دُنیوی محبت میں حسن والی محبت کا درجہ احسان والی محبت کے درجہ سے کم ہے کیونکہ احسان کی محبت میں اخلاق کا دخل ہے اور حسن کی محبت میں صرف طبعی میلان کا بلکہ پس پردہ لذتِ جسمانی کے حصول کی خواہش کا۔لیکن روحانی محبت میں حقیقت اُلٹ جاتی ہے اور احسان کی وجہ سے جو محبت ہو وہ حسن کی وجہ سے محبت سے ادنیٰ سمجھی جاتی ہے۔ انسان میں حسن پہلے نظر آتا ہے اور احسان بعد میں۔ گویا حسن ظاہر ہے اور احسان مخفی اور اس وجہ سے احسان حسن سے اعلیٰ مقام پر ہے۔مگر اللہ تعالیٰ کی ذات کے لحاظ سے احسان پہلے نظر آتا ہے اور حسن بعد میں۔یعنی حسن الٰہی، احسانِ الٰہی سے زیادہ مخفی ہے۔اِسی کی طرف اللہ تعالیٰ اِس آیت میں اشارہ فرماتا ہے کہ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ [۹۸] تمہاری آنکھیں اُس کو نہیں دیکھ سکتیں کیونکہ وہ لطیف ہستی ہے لیکن وہ خود چل کر تمہارے پاس آجاتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ تمہارے دل میں اُس کی محبت کی تپش پائی جاتی ہے اِسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے پوچھا کہ یَا رَسُوْلَ اللہ کیا آپ نے کبھی خدا کو بھی دیکھا ہے؟ آپؐ نے فرمایا نُوْرٌ اَنّٰی اَرَاہُ [۹۹] وہ تو ایک نور ہے اُس کو کس طرح دیکھا جاسکتا ہے یعنی خدا تعالیٰ کی رؤیت جسمانی نہیں ہوتی۔ پس حسن الٰہی ایک نئی حس سے نظر آتا ہے جو محبت میں ترقی کرتے

کرتے انسانوں کو حاصل ہوتی ہے لیکن اس کے برخلاف انسانی حسن سب سے پہلے نظر آنے والی شئے ہے اور اس کے دیکھنے کے لئے کسی محنت کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن احسان بعد میں نظر آتا ہے اور اس کے لئے عقل اور فکر سے کام لینا پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پانی دیا ہے، روٹی دی ہے، ہوا دی ہے، سورج دیا ہے، چاند دیا ہے، سیارے اور ستارے دیئے ہیں، زمین بنائی ہے، آسمان بنایا ہے یہ سب اُس کے احسانات ہیں جو بالکل ظاہر ہیں لیکن (حسن الٰہی ایک مخفی چیز ہے جس کے لئے جہاد کرنا پڑتا ہے۔ اِس لئے خدا کے معاملہ میں حسن کا مقام زیادہ بلند ہے اور یہ حسن الٰہی ظاہری آنکھوں سے نہیں بلکہ ایک نئی حس سے نظر آتا ہے جو احسان کے بعد آہستہ آہستہ ترقی پاتی ہے اور محبت کے اعلیٰ مدارج میں سے ہے اور احسان کی محبت سے بہت بالا ہے کیونکہ اس کے لئے آنکھیں بھی پیدا کرنی پڑتی ہیں اُس سے بہت اعلیٰ آنکھیں جو احسان دیکھنے کے لئے ضروری ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ محبت کے نہایت اعلیٰ مقام پر پہنچ کر یہ حسن نشوونما پاتا ہے اور قلب کی ایک نئی طاقت خدا تعالیٰ کے حسن کو دیکھنے اور چھونے پر قادر ہو جاتی ہے جو ہر انسان کو نہیں مل سکتی) اِسی کا ایک حصہ کانوں سے حسن کو معلوم کرنے کا ہے جو الہام کے ذریعہ سے انسان کو موہبت کے رنگ میں عطا ہوتا ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ جس کے ساتھ اُسے محبت ہے اُس کی آواز بھی سنے تا کہ اُس کے کان بھی اپنے محبوب کی آواز سے لُطف اندوز ہوں اور یہی خواہش اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کرنے والوں کے دلوں میں بھی پائی جاتی ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی شیریں آواز اُن کے کان میں آئے اور وہ اپنے محبوب سے راز و نیاز کی باتیں کریں لیکن ظاہر ہے کہ ہمارے یہ جسمانی

کان خدا تعالیٰ کی آواز کونہیں سُن سکتے۔ وہ تبھی سُنتے ہیں جب ایک نئی طاقت ہمارے اندر پیدا ہو جاتی ہے۔ دنیا میں تو جس طرح حسن اِن مادی آنکھوں سے دکھائی دے سکتا ہے اِسی طرح محبوب کی آواز بھی ہمارے یہ مادی کان سُن لیتے ہیں لیکن خدا تعالیٰ کے معاملہ میں جس طرح حسن الٰہی ایک نئی حس سے نظر آتا ہے اِسی طرح حسن آواز کے لئے نئے کان پیدا کرنے پڑتے ہیں جو گویا احسان کی قدر کے بعد ایک موہبت کے رنگ میں عطا ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں حسن کی وجہ سے محبت کا مقام زیادہ بلند ہے اور احسان کی وجہ سے محبت کا مقام اُس سے نیچے ہے۔

چوتھا ذریعہ محبت کا اقتضائے حاجات و رفع شہوات ہے۔ جیسے میاں بیوی کی محبت ہے یا مال کی محبت بھی اِسی قسم کی ہے لیکن ظاہر ہے کہ عورت اور مرد ایک دوسرے کی بہت ہی تھوڑی ضرورتیں پوری کرتے ہیں اور پھر جو ضرورتیں پوری کرتے ہیں اُن کے تمام سامان خدا تعالیٰ کے پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ پس قضائے حاجات کے لحاظ سے بھی اللہ تعالیٰ ہی سب سے زیادہ محبت کا مستحق ہے کیونکہ وہی سب سے زیادہ اپنے بندوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے والا ہے۔

پانچواں ذریعہ محبت کا رفاقت و مصاحبت ہے۔ اس کی مثال دوستوں کی محبت اور میاں بیوی کی محبت ہے۔ بیویاں نہ سب کی حسین ہوسکتی ہیں نہ ہمیشہ حسین رہ سکتی ہیں۔ خوبصورت سے خوبصورت بیوی بھی ہو تو بعض دفعہ بیماریوں کی وجہ سے وہ نہایت بدصورت ہو جاتی ہے مگر یہ نہیں ہوتا کہ بیوی بدصورت ہو جائے تو خاوند اُسے چھوڑ دے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ گو ابتداء میں اکثر میاں بیوی ایک دوسرے

سے اقتضائے حاجات اور حسن کی وجہ سے محبت کرتے ہیں یعنی وہ ایک دوسرے کو اچھے لگتے ہیں اور ایک دوسرے کے کام آتے ہیں اور ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں اِس لئے وہ آپس میں محبت رکھتے ہیں لیکن بعد میں حسن اور شہوت، رفاقت اور مصاحبت کی محبت سے بدل جاتے ہیں اور حسن بھول جاتا ہے گویا چونکہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہتے ہیں اور ایک دوسرے کی ضروریات کو پورا کرتے ہیں اِس لئے اُن کی محبت ایک نیا چولہ بدلتی ہے جو بڑھاپے تک قائم رہتی ہے۔ اُس وقت وہ عورت جس پر وہ کسی زمانہ میں اُس کے حسن کی وجہ سے جان چھڑک رہا تھا اپنے سارے حسن کو کھو بیٹھتی ہے مگر مرد اُس سے پھر بھی محبت کر رہا ہوتا ہے۔ اگر اُس عورت کی کوئی تصویر کھینچ کر دوسرے کے پاس لے جائے اور کہے بتاؤ کیا تم اِس عورت سے محبت کر سکتے ہو؟ تو وہ دیکھتے ہی کہے گا کہ کیا تم مجھے احمق سمجھتے ہو کیا یہ اِس قابل ہے کہ اِس کے ساتھ محبت کی جائے۔ اِس کی بھویں لٹکی ہوئی ہیں، چہرہ سُوکھا ہوا ہے، دانت کوئی ہے نہیں، کمر کبڑی ہو چکی ہے اور تم کہتے ہو کہ میں اِس کے ساتھ محبت کروں لیکن اُس کا خاوند اب بھی اُس پر جان دیتا ہے کیونکہ اُس کی حسن اور قضائے حاجت والی محبت رفاقت اور مصاحبت کی محبت سے بدل چکی ہوتی ہے۔ اِس رفاقت اور مصاحبت کو لو تو یہ بھی خدا تعالیٰ میں سب سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ اِسی کی طرف قرآن کریم میں اِن الفاظ میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ **وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا** [۱۰۱] یعنی تمہاری محبتیں شکلوں کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے تمہیں آپس میں اس طرح سمو دیا ہے کہ تمہیں شکلیں یاد ہی نہیں رہیں بلکہ تم ایک دوسرے کا حصہ ہو گئے ہو اور جیسا کہ میں نے بتایا ہے سَو میں

اسّی میاں بیوی جن کی زندگی آرام سے گزرتی ہے اور وہ آپس میں محبت کرتے ہیں۔ اُن کی زندگی اِسی رفاقت اور مصاحبت کی وجہ سے اچھی ہوتی ہے۔ اگر حسن اور قضائے حاجت کا سوال ہوتا تو شاید وہ اس طرح محبت نہ کر سکتے۔

(۶) کبھی محبوبوں کا اجتماع کرنے والے سے بھی محبت ہوتی ہے۔ جیسے بعض لوگ بعض خاص کلبوں سے محبت رکھتے ہیں کیونکہ وہاں ایسے لوگ اکٹھے ہوتے ہیں جن سے اُنہیں لگاؤ ہوتا ہے۔ بعض خاص قسم کی سوسائٹیوں کو پسند کرتے ہیں کیونکہ وہاں ایسے لوگ آتے ہیں جن سے مل کر اُنہیں حظ اور سرور حاصل ہوتا ہے۔ وطن کی محبت بھی اِسی وجہ سے ہوتی ہے کہ وہاں اُن سے تعلقاتِ محبت رکھنے والے لوگ زیادہ پائے جاتے ہیں۔ اِسی طرح شہروں اور محلّوں کی محبت کی وجہ بھی یہی ہوتی ہے کہ انسان کہتا ہے اِس محلّہ میں میرا چچا اور ماموں یا دوسرے رشتہ دار موجود ہیں۔ جب کسی شخص کو وطن سے باہر بھجوایا جائے تو چونکہ وہ جگہ ایسی ہوتی ہے جو اُس کے محبوبوں کو جمع نہیں کرتی اِس لئے اس کی طبیعت میں بے چینی رہتی ہے۔ پھر جس طرح بعض خاص کلبیں، مجالس، شہر اور محلّے مختلف محبتوں کو یکجا کرنے کی وجہ سے انسان کو محبوب ہوتے ہیں اِسی قسم کی محبت بعض رشتہ داروں سے بھی ہوتی ہے اور انسان کہتا ہے فلاں سے مجھے بڑی محبت ہے کیونکہ وہ میرے چچا کا بھی بیٹا ہے اور میری خالہ کا بھی بیٹا ہے تو دو رشتے اُس میں بھی ہو گئے ہیں۔ کئی خاوند اپنی بیویوں سے اِس لئے محبت کرتے جاتے ہیں کہ اُن سے نیک اولاد اُنہیں حاصل ہوئی ہوتی ہے۔ غرض دنیا میں یہ ایک عام نظارہ نظر آتا ہے کہ محبوبوں کا اجتماع کرنے والے سے انسان کو محبت ہوتی ہے۔ اِس نقطۂ نگاہ سے بھی اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ

اللہ تعالیٰ اِس محبت کا بھی مرکز ہے کیونکہ جو اچھا آدمی ہوگا وہ لازماً خدا سے بھی تعلق رکھتا ہوگا۔ اِس لئے خدا سے تعلق رکھ کر ہر اچھے آدمی سے تعلق پیدا ہوسکتا ہے۔ اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے کسی کو محبت ہے تو وہ بھی خدا کے پاس ہیں۔ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات سے کسی کو محبت ہے تو وہ بھی خدا کے پاس ہیں۔ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ذات سے کسی کو محبت ہے تو وہ بھی خدا کے پاس ہیں۔ غرض جتنے حسین اور قابلِ محبت وجود خدا تعالیٰ میں جمع ہوتے ہیں اور کہیں جمع نہیں ہوتے۔ اُس کی جنت میں تمام نیک جمع ہو جاتے ہیں اور تمام محب اور محبوب اُس کی طاقت سے محب اور محبوب بنتے ہیں۔ پس اس نقطۂ نگاہ سے بھی خدا تعالیٰ کا وجود ہی اِس قابل ہے کہ اُس کے ساتھ محبت کی جائے اور اِسی امر پر غور کرنے سے انسان اللہ تعالیٰ سے محبت بڑھا سکتا ہے۔

(۷) طویل تعلق اور آئندہ ترقیات کی وابستگی کے احساس سے بھی محبت پیدا ہوتی ہے۔ بادشاہوں سے یا وطن سے یا سیاسی اور مذہبی پارٹیوں سے اِسی جہت سے محبت ہوتی ہے۔ بعض لوگ جو سینکڑوں سال سے حنفی چلے آرہے ہیں اُنہیں طبعی طور پر حنفیوں سے ہی محبت ہوتی ہے اور بعض دفعہ وہ بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ ہمارا خاندان تو سات پشت سے حنفی ہے یا ہمارا خاندان سات پشت سے وہابی ہے۔ اِسی طرح وہ سیاسی پارٹیاں جو ایک لمبے عرصہ تک برسرِاقتدار رہتی ہیں اُن کے ساتھ بھی لوگوں کو محبت ہوتی ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ فلاں بڑی مضبوط پارٹی ہے۔ اگر ہم اُس پارٹی کے ساتھ تعلق پیدا کریں گے تو ہمیں فائدہ ہوگا۔ غرض سابق لمبا تعلق یا آئندہ کے لمبے تعلق کی امید بھی انسان کے دل میں محبت پیدا کر دیتی ہے عادات سے محبت بھی اِسی وجہ سے ہوتی ہے کہ اُن کے ساتھ ایک لمبا تعلق

رہ چکا ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے لحاظ سے یہ وجہ بھی بڑی قوی ہے کیونکہ آئندہ ترقیات جتنی اُس سے وابستہ ہوسکتی ہیں اور کسی سے نہیں اور طویل تعلق زمانۂ سابق یا مستقبل کے لحاظ سے بھی جتنا اُس سے ہے اور کسی سے نہیں۔

(۸) آٹھویں وجہ محبت کی سکون کا حاصل ہونا ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی سکون سے بھی محبت پیدا ہوتی ہے یعنی یہ دونوں چیزیں آپس میں لازم وملزوم ہیں۔ محب کے وصال سے سکون اور حصولِ سکون سے محبت پیدا ہوتی ہے گویا اِن دونوں کا آپس میں خالق ومخلوق کا تعلق ہے۔ کبھی یہ خالق اور وہ مخلوق اور کبھی یہ مخلوق اور وہ خالق ہوتا ہے۔ یہ سکون کبھی عقلی ہوتا ہے اور کبھی جذباتی۔ عقلی جیسے کھانے پینے اور پہننے سے سکون حاصل ہوتا ہے اور جذباتی جیسے تعلقاتِ مردوزن سے۔ کبھی تسکین کی امید کی وجہ سے بھی محبت پیدا ہوتی ہے یعنی امید ہو کہ اُس سے تسکین حاصل ہوگی جیسے سیاسی یا مذہبی پروگرام وغیرہ جن سے مُلکی ترقی یا اُخروی زندگی کی امید ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ امر بھی سب سے زیادہ چسپاں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے جس سکون کے ملنے کا امکان ہوسکتا ہے غیر سے نہیں کیونکہ غیر کی نعمت ٹوٹ سکتی ہے لیکن خدا تعالیٰ کی نعمت جاری ہے اور ترقیات وہ بہت زیادہ دے سکتا ہے۔

غرض جتنے موجباتِ محبت ہیں وہ سارے کے سارے نہایت شدت سے اللہ تعالیٰ کے وجود میں پائے جاتے ہیں۔ اِس لئے جب ایک ایک وجہ شدید محبت پیدا کرسکتی ہے تو جس میں وہ سب وجوہ پائی جائیں اور شدت سے پائی جائیں اُس سے کیوں محبت نہ ہوگی۔ ضرورت اِس بات کی ہے کہ ذکر وفکر سے اِن اُمور کا احساس

غائب سے حاضر میں لایا جائے اور عدم سے وجود میں اُن کو تبدیل کیا جائے۔

(۹) ایک ذریعہ محبت کا تحریک وتحریص بھی ہوتا ہے۔ جب بار بار کسی حسین چیز کا ذکر کیا جائے تو لوگوں کو سُن سُن کر بھی محبت پیدا ہو جاتی ہے۔عربوں میں قصہ مشہور ہے کہ ایک شخص نے کسی کتاب میں پڑھا کہ اُستادوں سے دوستانہ تعلقات نہیں رکھنے چاہئیں کیونکہ وہ بے وقوف ہوتے ہیں۔ اُس کے ایک استاد سے بڑے اچھے تعلقات تھے جو ایک لمبے عرصہ تک قائم رہے اور وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ استاد تو بڑے اچھے ہوتے ہیں معلوم نہیں لکھنے والے نے یہ کس طرح لکھ دیا کہ استاد بے وقوف ہوتے ہیں۔ ایک دفعہ وہ اُن سے کچھ عرصہ کے بعد ملنے کے لئے گیا تو اُسے معلوم ہوا کہ استاد صاحب بیمار ہیں۔ اُس نے لوگوں سے دریافت کیا کہ وہ کب سے بیمار ہیں تو اُنہوں نے جواب دیا کہ مدت ہوگئی وہ تو گھر سے نکلتے ہی نہیں۔ وہ بہت پریشان ہوا اور آخر دریافت حالات کے لئے اُن کے مکان پر پہنچا۔ بیوی نے اُن سے کہا کہ آپ اُن کے اچھے دوست ہیں آپ نے خبر بھی نہیں لی کہ اُن کا کیا حال ہے وہ تو مرنے کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ اِسے سن کر بہت افسوس ہوا اور اس نے کہا کہ پردہ کروا دیں تا کہ میں خود اُن سے حال دریافت کرسکوں۔ چنانچہ وہ اندر گیا دیکھا تو واقعہ میں استاد صاحب بڑے مضمحل اور کمزور ہو چکے تھے اور ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ رہ گئے تھے۔ اُس نے پوچھا کہ آپ کو بیماری کیا ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ بیماری کی کچھ سمجھ نہیں آئی بہت علاج کروایا ہے مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ اس نے کہا آخر کچھ تو بتایئے کہ یہ بیماری آپ کو شروع کس طرح ہوئی ہے؟ اُس نے کہا بات یہ ہے کہ جب میں کتابیں پڑھتا اور اُن میں محبت اور عشق کے واقعات دیکھتا

تھا تو میرے دل میں بھی بار بار خیال آتا تھا کہ مجھے بھی محبت کرنی چاہیے مگر میں سمجھتا تھا کہ میری محبت کسی معمولی عورت سے نہیں ہوسکتی۔ دنیا میں جو سب سے زیادہ حسین عورت ہوگی اُس سے میں محبت کروں گا چنانچہ ایک دن میں اپنی گلی میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص میرے پاس سے گزرا اور اُس نے ایک شعر پڑھا جس کا مفہوم یہ تھا کہ اُمِّ عمرو ایسی حسین عورت ہے کہ ساری دنیا اُس پر عاشق ہے۔ میں نے کہا کہ بس عشق کرنا ہے تو اُمِّ عمرو سے ہی کرنا ہے۔ چنانچہ میں نے اُس سے محبت کرنی شروع کردی۔ اُس نے کہا یہ تو فرمایئے آپ نے اُمِّ عمرو کبھی دیکھی بھی تھی یا نہیں؟ کہنے لگا میں نے دیکھی تو نہیں لیکن جب ساری دنیا اُس سے محبت کرتی تھی تو میں نے سمجھا کہ میں بھی اُس سے کیوں نہ محبت کروں۔ چنانچہ میں اپنی محبت اور عشق میں ترقی کرتا چلا گیا اور دل میں بار بار حسرت پیدا ہوتی تھی کہ اُمِّ عمرو کا مجھے وصال حاصل ہو مگر مدتیں گزر گئیں اور اُمِّ عمرو کا کچھ پتہ نہ چلا۔ ایک دن میں پھر اپنی گلی میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص گزرا اور اُس نے یہ شعر پڑھا کہ

لَقَدْ مَرَّ الْحِمَارُ بِاُمِّ عَمْرٍو
فَمَا رَجَعَتْ وَمَا رَجَعَ الْحِمَارُ

کہ اُمِّ عمرو کو گدھا لے کر چلا گیا اور اِس کے بعد نہ وہ لَوٹی اور نہ گدھا لَوٹا۔ میں نے سمجھ لیا کہ وہ جو لَوٹی نہیں تو ضرور مَر چکی ہے۔ چنانچہ اُس دن سے میں چارپائی پر پڑا ہوں اور حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی چلی جارہی ہے۔ آپ خود ہی انصاف فرمائیں کہ جب محبوب ہی نہ رہا تو اِس دنیا میں زندہ رہ کر کیا کرنا ہے۔ وہ یہ قصہ سُن کر لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّابِاللّٰہِ کہتے ہوئے وہاں سے اُٹھا اور کہنے لگا کتاب میں

سچ لکھا تھا کہ استاد بے وقوف ہوتے ہیں۔

تو حقیقت یہ ہے کہ بار بار کسی چیز کا ذکر سننے سے بھی محبت ہو جاتی ہے۔ بار بار یہ کہنا کہ خدا بڑا پیارا ہے، خدا بڑا محسن ہے، خدا بڑا مہربان ہے، خدا ہم سب کی ضروریات پوری کرتا ہے، خدا ہم سب کو روزی دیتا ہے، خدا ہماری دعائیں سنتا ہے، خدا ہماری مشکلات دور کرتا ہے۔ اِسی طرح وعظ ونصیحت کی مجالس منعقد کرنا اور خدا تعالیٰ سے محبت پیدا کرنے کی ترغیب دلانا۔ یہ چیزیں ایسی ہیں جو رفتہ رفتہ انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کر دیتی ہیں چنانچہ دیکھ لو جہاں سخاوت کا ذکر آئے گا لوگ فوراً کہہ اُٹھیں گے کہ حاتم بڑا سخی تھا حالانکہ نہ اُنہوں نے حاتم کو دیکھا نہ اُس کے حالات پڑھے محض اس لئے کہ لوگوں کی زبان پر حاتم کا بار بار ذکر آتا ہے ہر شخص حاتم سے محبت کرتا ہے۔ اِسی طرح ایک پنجابی جو نہ یونان کا نام جانتا ہے نہ اُس مُلک کے حالات سے واقفیت رکھتا ہے فوراً کہہ دے گا کہ تو بڑا افلاطون آیا ہے یا جب کوئی شخص اپنی بہادری کی ڈینگیں مارے تو لوگ کہتے ہیں بڑا رُستم بنا پھرتا ہے حالانکہ کہا جاتا ہے کہ رُستم کوئی حقیقی وجود نہیں تھا محض قصہ کہانیوں میں بہادری کے ذکر کے لئے ایک نام تجویز کر لیا گیا ہے۔ پھر اور باتوں کو جانے دو زلیخا کے حسن کے اتنے قصے مشہور ہیں کہ جن کی کوئی حد ہی نہیں۔ اچھے معقول اور تعلیم یافتہ آدمیوں نے بعض دفعہ مجھ سے پوچھا ہے کہ کیا یہ سچ ہے کہ زلیخا اتنی حسین تھی کہ اُس سے بڑھ کر اور کوئی حسین عورت نہیں تھی؟ اب زلیخا مَر کے مٹی بھی ہو گئی مگر اُس کے حسن کا چرچا باقی ہے کیونکہ لوگوں میں اُس کا بار بار ذکر آتا ہے۔ اِسی طرح لیلیٰ ضرور اچھی ہوگی لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ ہماری کئی نوکرانیاں اُس سے اچھی ہوں مگر

اِس وجہ سے کہ بار بار لیلیٰ کا ذکر آتا ہے اُس کا دماغوں پر ایسا نقشہ کھنچ گیا ہے کہ انسان خیال کرتا ہے کہ لیلیٰ سے بڑھ کر کوئی خوبصورت عورت ہو ہی نہیں سکتی۔ پس کسی کا اچھا ذکر سن سن کر بھی اُس سے محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ جب ہماری عقل بتاتی ہے کہ خدا سب سے اچھا ہے تو اگر قوم میں اِس امر کو جاری کیا جائے کہ محبت الٰہی کا ذکر بار بار ہو اور لوگوں کو تحریک کی جائے کہ وہ خود بھی ذکر وفکر کریں اور دوسروں سے بھی کروائیں اور اِس ذکر کو عام کرنے کے لئے وعظ ونصیحت کی مجالس منعقد کی جائیں اور بچوں کے کانوں میں بھی یہ باتیں ڈالی جائیں، بیویوں کے کانوں میں بھی یہ باتیں ڈالی جائیں، ماں باپ کے کانوں میں بھی یہ باتیں ڈالی جائیں تو غیر شعوری طور پر لوگوں کے دلوں میں محبت الٰہی پیدا ہو جائے گی اور قوم میں ایسے لوگ زیادہ سے زیادہ تعداد میں نظر آنے لگیں گے جو خدا کے نام پر سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہوں گے۔

دیکھو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیثیت ہی کیا ہے۔ مگر اس وجہ سے کہ عیسائی بچپن سے ہی اپنی قوم کے افراد کے دلوں میں یہ نقش کرتے رہتے ہیں کہ عیسیٰ بڑا ہے کوئی عیسائی بھی خواہ وہ دہریہ ہی کیوں نہ ہو یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عیسیٰ پر فضیلت دی جائے۔ میں جب انگلستان گیا تو ایک عیسائی ڈاکٹر جو دہریہ تھا مجھ سے ملنے کے لئے آیا اور اُس نے مذہبی گفتگو شروع کر دی مگر تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بڑی بے باکی کے ساتھ حملہ کر دیتا تھا۔ تین چار دفعہ تو میں نے برداشت کیا مگر جب بار بار اُس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کیا تو میں

نے کہا کیا تم جانتے نہیں عیسیٰ میں فلاں فلاں نقص تھے جن کو انجیل سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔ جب میں نے عیسیٰ کا نام لیا تو وہ آگ بگولہ ہو گیا اور کہنے لگا عیسیٰ کا نام نہ لیں یہاں عیسیٰ کا کیا ذکر ہے میں عیسیٰ کے متعلق کوئی بات سن نہیں سکتا۔ میں نے کہا تم اگر عیسیٰ کے متعلق کوئی بات نہیں سن سکتے تو میں بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کوئی بات نہیں سن سکتا۔ وہ دہریہ تھا مگر اس وجہ سے کہ بچپن سے اُس کے کانوں میں یہ بات ڈالی جاتی رہی تھی کہ عیسیٰ سب سے بڑا ہے باوجود دہریہ ہونے کے وہ اِس بات کو برداشت نہ کر سکا کہ عیسیٰ پر اعتراض کیا جائے۔

اِسی طرح جب میں حج کے لئے گیا تو جس جہاز میں میں نے سفر کیا اُسی میں تین بیرسٹر بھی سفر کر رہے تھے۔ ایک ہندو تھا اور دو مسلمان مگر وہ دونوں دہریہ تھے۔ خدا تعالیٰ کی ہستی پر ایمان نہیں رکھتے تھے چنانچہ میرے ساتھ اُن کی لمبی بحث رہی۔ وہ خدا تعالیٰ کی ہستی پر بار بار مذاق اُڑاتے اور بعض دفعہ ایک تنکا نکال کر سامنے رکھ دیتے کہ اگر تمہارے خدا میں طاقت ہے تو وہ یہ تنکا ہِلا کر دکھائے۔ ہندو بیرسٹر بھی اُن اعتراضات میں اُن کا شریک ہوا کرتا تھا۔ ایک دن اس بحث کے دوران میں جب کہ ہندو بیرسٹر بات کر رہا تھا اُس نے مثال میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی گستاخی سے ذکر کر دیا۔ بس اُس کا یہ ذکر کرنا تھا کہ وہ دونوں بیرسٹر جو خدا کی ہستی پر رات دن مذاق اُڑاتے رہتے تھے یکدم غصہ کے ساتھ اُس سے کہنے لگے کہ دیکھو میاں! اب اِس کے بعد تم نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نہیں لینا ورنہ ہماری اور تمہاری دوستی بالکل ٹوٹ جائے گی۔ اُس نے کہا جب تم خدا کو ہی نہیں مانتے تو رسول کے ماننے کا سوال کیسا؟ وہ کہنے لگے کچھ ہو خدا کو جو

مرضی ہے کہہ لومگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہم کوئی بات برداشت نہیں کر سکتے۔ اب اِس کی وجہ کیا ہے؟ وجہ یہی ہے کہ ماں باپ نے بچپن سے ''تحفظِ ختم نبوت'' کی تلقین کی ہوئی ہوتی ہے اور چونکہ بچپن سے وہ سنتے چلے آتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب نبیوں سے بڑے ہیں اِس لئے وہ یہ بحث تو کر لیں گے کہ خدا ہے یا نہیں مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کے خلاف وہ کوئی بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ تو بار بار سننے سے بھی محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ اِسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ **حَبِّبُوا اللّٰہَ اِلٰی عِبَادِہٖ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ**[101] یعنی لوگوں کے اندر تم ایسی باتیں کیا کرو جن سے خدا کی محبت پیدا ہو اِس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خدا بھی تم سے محبت کرنے لگے گا۔ اگر تم اپنے بچوں کو اور بڑوں کو، دوستوں کو اور رشتہ داروں کو محبت الٰہی کی ضرورت اور اُس کے حصول کی اہمیت بتاؤ اور محبت پیدا کرنے والے افعال کا ذکر بار بار اپنی مجالس میں محبت اور پیار سے کرتے رہو تو تمہاری محبت بھی بڑھے گی اور اُن کی بھی۔

(۱۰) دسواں طریقہ محبت الٰہی کے حصول کا دعا ہے جو ساری کامیابیوں کی جڑ ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ **اٰخِرُ الدَّوَاءِ اَلْکَیُّ**[102] کہ آخری علاج داغ دینا ہوتا ہے۔ اِسی طرح سارے کاموں کا آخری انحصار دعا پر ہے۔ پس انسان کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جھکے اور اُس سے کہے کہ الٰہی! تیرا وجود مخفی ہے میری عقل سخت ناقص اور ناتمام ہے مگر میرے دل کے مخفی گوشوں میں تیرے وصال کی ایک نہ مٹنے والی خواہش پائی جاتی ہے۔ میرا دل تجھ سے ملنے کے لئے بیتاب ہے میں چاہتا ہوں کہ تیری محبت کو حاصل کروں۔ مگر اے میرے

رَبّ! میری کوششیں اُس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتیں جب تک تیرے فضل میرے شاملِ حال نہ ہوں۔ پس تو اپنی محبت سے مجھے حصہ عطا فرما اور مجھے اُن لوگوں میں شامل فرما جو تیرے مُحِبّین کے پاک گروہ میں شامل ہیں۔ چنانچہ حدیثوں سے ثابت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرمایا کرتے تھے کہ اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ حُبَّکَ وَحُبَّ مَنْ اَحَبَّکَ وَحُبَّ مَا یُقَرِّبُنِیْ اِلَیْکَ وَاجْعَلْ حُبَّکَ اَحَبَّ اِلَیَّ مِنَ الْمَاءِ الْبَارِدِ [۱۰۳]

اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ حُبَّکَ یعنی اے میرے خدا مجھے اپنی محبت عطا فرما وَحُبَّ مَنْ اَحَبَّکَ اور اے خدا جو تجھ سے محبت کرتے ہیں میرے دل میں تو اُن کی محبت بھی ڈال دے وَحُبَّ مَا یُقَرِّبُنِیْ اِلَیْکَ اور ان کاموں کی اور ان اعلیٰ درجہ کے اخلاق کی اور ان قربانیوں اور نیکیوں کی بھی میرے دل میں محبت ڈال دے جن سے تیری محبت پیدا ہوتی ہے وَاجْعَلْ حُبَّکَ اَحَبَّ اِلَیَّ مِنَ الْمَاءِ الْبَارِدِ اور اے میرے رَبّ! اپنی محبت میرے دل میں اُس سے بھی زیادہ پیدا کردے جتنی شدید گرمی کے موسم میں انسان کو ٹھنڈے پانی کی محبت ہوتی ہے۔ الْمَاءِ الْبَارِدِ کے معنی ٹھنڈے پانی کے بھی ہیں اور ماء کو حیات کا مرکز بھی قرار دیا گیا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ [۱۰۴] ہم نے پانی سے ہر چیز کو زندہ کیا ہے۔ پس یہ بھی ہوسکتا ہے کہ الْمَاءِ الْبَارِدِ سے یہاں صرف جسمانی پانی مراد نہ ہو بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد یہ ہو کہ تیری محبت اِتنی پیاری ہو کہ مرکز حیات کی محبت بھی میرے دل میں اِس قدر نہ ہو۔ بہرحال یہ دعا ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مانگا کرتے تھے اور جس پر دوام انسان کے دل

میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کر دیتا ہے۔

وقت کم تھا لیکن پھر بھی میں نے جلدی جلدی اپنے مضمون کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے۔ دوستوں کو چاہیے کہ اپنے اندر تغیر پیدا کرنے کی کوشش کریں تا کہ یہ جسمانی زندگی ختم ہونے سے پہلے پہلے ہم میں سے ہر شخص کے دل میں محبت الٰہی پیدا ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنی محبت عطا فرمائے اور اپنے مَاسِوَا کی محبت ہمارے دلوں سے سرد کر دے اور جن سے محبت کرنا اُس کے منشاء کے مطابق ہو اُن سے اِس قسم کی اور اتنی محبت ہمیں ہو کہ جس سے خدا تعالیٰ کی محبت بڑھے اور اُس کا تعلق زیادہ ہو حتّٰی کہ ہماری محبت اُس کی محبت کو کھینچ لے اور وہ ہمارا چاہنے والا ہو جائے اور ہم اُس کے۔ اَللّٰھُمَّ اٰمِیْنَ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

حوالہ جات

۱۔ پیدائش باب ۵ آیت ۲۲۔ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی لاہور ۱۹۴۳ء

۲۔ جیوش انسائیکلو پیڈیا جلد ۵ صفحہ ۱۷۸ تا ۱۸۱ (ترجمہ مفہوماً)

۳۔ پیدائش باب ۳۲۔آیت ۲۴ تا ۲۸۔ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی لاہور ۱۹۴۳ء

۴۔ اقرب الموارد جلد ۲ صفحہ ۸۲۱۔مطبوعہ بیروت ۱۸۸۹ء

۵۔ اقرب الموارد جلد ۲ صفحہ ۸۲۱ مطبوعہ بیروت ۱۸۸۹ء

۶۔ اقرب الموارد جلد ۲ صفحہ ۸۲۱ مطبوعہ بیروت ۱۸۸۹ء

۷۔ المنجد صفحہ ۵۲۶۔مطبوعہ بیروت ۱۹۶۰ء

۸۔

۹۔ العلق: ۳

۱۰۔

۱۱۔ اٰل عمران: ۶۰ ۱۲۔ الانبیاء: ۳۸ ۱۳۔ البقرۃ: ۱۱۸

۱۴، ۱۵۔ اقرب الموارد جلد ۲ صفحہ ۸۲۲۔مطبوعہ بیروت ۱۸۸۹ء

۱۶۔ الکھف: ۵۵

۱۷۔ مسلم کتاب التوبۃ باب فی الحض علی التوبۃ (الخ)

۱۸۔ اقرب الموارد جلد ۱ صفحہ ۶۸۹ مطبوعہ بیروت ۱۸۸۹ء

۱۹۔ بخاری کتاب الرقاق باب التواضع

۲۰، ۲۱۔ اقرب الموارد جلد ۱ صفحہ ۴۱۵۔مطبوعہ بیروت ۱۸۸۹ء

۲۲۔الانبیاء:۹۱ ۲۳۔التوبۃ:۵۹ ۲۴۔القلم:۳۳

۲۵تا۲۸۔ المفردات فی غریب القرآن صفحہ ۱۹۷۔مطبوعہ مصر ۱۳۲۴ھ

۲۹، ۳۰۔ المفردات فی غریب القرآن صفحہ ۱۹۷۔۱۹۸ مطبوعہ مصر ۱۳۲۴ھ

۳۱تا۳۴۔ اقرب الموارد جلد ۱ صفحہ ۲۰۔مطبوعہ بیروت ۱۸۸۹ء

۳۵تا۳۸۔ المفردات فی غریب القرآن صفحہ ۲۷ مطبوعہ مصر ۱۳۲۴ھ

۳۹، ۴۰۔ المفردات فی الغریب القرآن صفحہ ۲۷ مطبوعہ ۱۳۲۴ھ

۴۱۔ طٰہٰ:۱۱

۴۲۔اقرب الموارد جلد ۲ صفحہ ۱۴۳۷ مطبوعہ بیروت ۱۸۸۹ء

۴۳۔نوح: ۲۴ ۴۴۔ مریم:۹۷ ۴۵۔ ہود:۹۱

۴۶۔البروج:۱۵

۴۷۔*__طویلہ:__* *گھوڑوں کا تھان۔گھوڑوں کے باندھنے کی جگہ*

۴۸۔النسائی کتاب النکاح باب کراھیۃ تزویج العقیم

۴۹۔المائدہ:۵۵ ۵۰۔ البقرۃ:۱۶۶ ۵۱۔ التوبۃ:۲۴

۵۲۔مسند احمد بن حنبل جلد ۳ صفحہ ۲۰۷۔مطبوعہ بیروت ۱۹۷۸ء

۵۳، ۵۴۔ تفسیر درمنثور للسیوطی جلد ۱ صفحہ ۲۶۱۔مطبوعہ بیروت ۱۳۱۴ھ

۵۵۔طٰہٰ:۱۱۶ ۵۶، ۵۷۔البقرۃ:۳۸ ۵۸۔ النساء:۱۲۶

۵۹۔بخاری کتاب فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم سدوا الابواب (الخ)

۶۰۔کنز العمال جلد ۳ صفحہ ۳۷۲ مطبوعہ حلب ۱۹۷۰ء

۶۱۔ مسلم کتاب التوبۃ باب فی سعۃ رحمۃ اللہ تعالیٰ (الخ)

۶۲۔البقرۃ:۲۵۶

۶۳۔بدر ۱۱ جنوری ۱۹۱۲ء صفحہ ۶

۶۴۔مسلم کتاب التوبۃ باب فی الحض علی التوبۃ

۶۵۔الانعام:۷۷ ۶۶۔ اٰلِ عمران:۳۲ ۶۷۔ المائدہ:۵۵

۶۸۔

۶۹۔النساء:۳۷ ۷۰۔ البقرۃ:۱۹۱

۷۱۔النساء:۱۰۸

۷۲۔ترمذی ابواب البر و الصلۃ باب ماجاء فی الشکر (الخ)

۷۳۔اسد الغابۃ جلد ۳ صفحہ ۱۵۷ مطبوعہ ریاض ۱۲۸۶ھ

۷۴۔القصص:۷۷ ۷۵۔ القصص:۷۸ ۷۶۔ الحج:۳۹

۷۷۔ابراھیم:۸ ۷۸۔ الانعام:۱۴۲، الاعراف:۳۲

۷۹۔مسلم کتاب البر و الصلۃ باب فضل عیادۃ المریض

۸۰۔ال عمران:۱۴۱ ۸۱۔ البقرۃ:۱۵۳ ۸۲۔ المائدۃ:۱۲

۸۳۔ابو داؤد کتاب الادب باب فی المطر

۸۴۔الشعراء:۴ ۸۵۔ اٰلِ عمران:۱۴۹ ۸۶۔ یٰسن:۸۳

۸۷۔البقرۃ:۲۲۳ ۸۸۔ ال عمران:۱۶۰ ۸۹۔ المائدۃ:۴۳

۹۰۔ ال عمران:۷۷

۹۱۔بخاری کتاب الصوم باب من صَام رمضان ایمانًا و احتسابًا (الخ)

۹۲۔ **قاز:** راج ہنس، ایک قسم کی مرغابی

۹۳۔ الروم:۳۱ ۹۴۔ النساء:۲

۹۵۔ یود احدھم لو یعمر الف سنة (البقرۃ:۹۷)

۹۶۔ النحل:۶۲ ۹۷۔ الفتح:۹ تا۱۱ ۹۸۔ الانعام:۱۰۴

۹۹۔ مسلم کتاب الایمان باب فی قولہ علیہ السلام نور انّٰی اراہ (الخ)

۱۰۰۔ النحل:۴۳

۱۰۱۔ المعجم الکبیر للطبرانی جلد ۸ صفحہ ۹۱ مطبوعہ قاہرہ ۱۹۸۵ء

۱۰۲۔

۱۰۳۔

۱۰۴۔ الانبیاء:۳۱